ذوالقعدہ ۱۴۴۲ھ۔ صفر المظفر ۱۴۴۳ھ
جولائی۔ستمبر ۲۰۲۱ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۴۰ — شمارہ ۳

ذوالقعدہ ۱۴۴۲ھ ۔ صفر المظفر ۱۴۴۳ھ — جولائی ۔ ستمبر ۲۰۲۱ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:
ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مدیر:
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:
حافظ عاکف سعید ۔ حافظ عاطف وحید
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ ۔ مؤمن محمود
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل : publications@tanzeem.org
سالانہ زرِتعاون : 280 روپے ، فی شمارہ : 70 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

''اَلْعِلْم'' کا ہماری درسگاہوں میں فقدان	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاک التأویل (۲۶)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	9

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	22

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۵و۶)	مؤمن محمود	38

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی یونیورسٹی کی ضرورت	ڈاکٹر رفیع الدّین	61

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	69

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

❀❀❀

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اَلْعِلْم'' کا ہماری درسگاہوں میں فقدان

ڈاکٹر ابصار احمد

ہم نے حکمت قرآن کے پچھلے شماروں میں عقیدے کے مباحث میں تفصیل سے دیکھا ہے کہ قرآن کریم کی دو آیات: ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (محمد:۱۹) اور ﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ﴾ (الانفال:۴۰) کے حوالے سے واضح ہے کہ ہمارے دینی تصوّرات میں مرکزی و بنیادی اللہ تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ پختہ علم اور تفصیلی دلیل کی روشنی میں ہونا ضروری ہے تاکہ اس عقیدے کے ثمرات ظاہر ہوں' اس میں شک کا خلجان اور نفس کا تردّد نہ رہے' اور یہ ایمان اور عقیدہ جویانِ حق اور تشنگانِ علم کے وجودی احوال میں متحقق ہو کر ان کے خلاق و اعمال کو نہ صرف قرآن و سُنّت کے قالب میں ڈھال دیں بلکہ وہ دینی تعلیمات و اقدار کے داعی بھی بن جائیں' اور اس طرح تہذیب اور معاشرے کی سطح پر حقیقی اور دیرپا تبدیلی کا باعث بنیں۔ محولہ بالا دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کے بطور الٰہ' مولیٰ اور معبود کا علم حاصل کرنا صیغہ امر میں آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ از روئے قرآن اللہ کو خالق و مالک اور معبود و مسجود ماننا پورے تیقن اور علم و عرفان کی روشنی کے ساتھ تاکیداً مطلوب ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے دینی معتقدات اندھے اور بے عقل تصوّرات (dogmas) نہیں' بلکہ تعقل' بصیرت و عرفان اور فقہ عمیق پر مبنی ہیں جو تنزیل ربانی کی تابانی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ محض محدود انسانی حواس اور استنباطی عقل کے زائیدہ نہیں ہیں۔ قرآن و سُنّت سے کشید کردہ علم ہی ہمارے سلف صالحین کے نزدیک 'العلم' ہے' یعنی صحیح اور مکمل معنوں میں علم ''العلم'' ہی ہے' جبکہ انسانی حیاتِ دنیوی کے مسائل' تفہیم اور ان کے حل کے ذرائع و وسائل کی دریافت و تدریس محض علم بلکہ اس سے بھی کم تر فنون یا مہارتوں (skills) کے درجے کی چیزیں ہیں' جن سے باطنی نور' حکمت خالدہ اور علم حقیقی کا سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔

دینِ اسلام کے دو بنیادی اور اہم تر ماخذ — قرآن اور حدیثِ رسولؐ — میں علم ہی کے لیے دوسرا کلمہ/لفظ ''ہدایت'' استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جانے والی سورۃ الفاتحہ میں رب تعالیٰ سے ہماری دعا ہدایت — 'اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ' — کی ہوتی ہے۔ یعنی ''ہماری دعا ایسے علمِ نافع یعنی ہدایت کے لیے ہوتی ہے جو ہمیں سیدھے راستے پر چلاتے ہوئے اخروی صلاح و فلاح اور سعادتِ ابدی تک لے جائے۔ سورۃ الفاتحہ کے فوری بعد سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں الکتاب یعنی قرآن کریم کو ایسی کتاب قرار دیا گیا جو ریب و شک سے مبرّا اور جو متقین کے لیے ہدایت (guidance) ہے۔ علم کے متبادل ہدایت کے لفظ سے یہ حقیقت بھی ہمارے

سامنے آتی ہے کہ دین میں ایسا نظری علم جس کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو مطلوب و پسندیدہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلاسیکل دینی لٹریچر میں محمود اور مذموم علوم کی تفریق پائی جاتی ہے' اور خود نبی کریم ﷺ نے علم کے ضمن میں علمِ ضار کی بجائے علمِ نافع کی دعا کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے تناظر میں یہ ممکن نہیں کہ برے اخلاق کے حامل طالب علم کو وہ حقیقی علم حاصل ہو جائے جو راہِ آخرت میں نفع پہنچا سکے یا جس سے ابدی سعادت حاصل ہو سکے۔ بُرے اخلاق کے حامل جو علم حاصل کرتے ہیں وہ محض رسمی علم ہوتا ہے جو کبھی زبان پر رہتا ہے اور کبھی دل میں بھی اس کا اعادہ و تکرار ہو سکتا ہے' تاہم علم حقیقی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علم کثرتِ روایت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نور ہے جو اللہ دلوں میں القاء کر دیتا ہے۔ بعض اکابر صلحاء کا قول ہے کہ علم صرف خوفِ الٰہی کا نام ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ (فاطر :۲۸)

''اللہ سے اُس کے بندوں میں سے صرف علماء ڈرتے اور لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔''

جن حضرات نے علم کو خوفِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے انہوں نے علم کے اصل اور حقیقی نتیجہ کی نشاندہی کی ہے۔ جو شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو جتنا زیادہ جانے گا یعنی عرفانِ حق رکھے گا' اتنا ہی زیادہ خوف و خشیتِ الٰہی رکھے گا۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے اس جملے کا بھی یہی مفہوم ہے:

تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم ان یکون الا للہ

''ہم نے اللہ کے علاوہ کے لیے علم حاصل کیا مگر علم نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کے لیے ہو۔''

بعض محققین حضرات اس جملے کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں صرف ظاہری الفاظ و عبارت کا علم آیا' اس کی حقیقت نیت میں اخلاص کی کمی کے باعث ہم پر واضح نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے علمائے تحقیق اور فقہائے دین فروع و اصول میں تفوق و مہارت رکھنے کے باوجود مذموم عادتیں رکھتے ہیں' لیکن ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس علم میں ان کا اشتغال ہے وہ علم ہونے کی حیثیت سے مفید نہیں ہے۔ اس علم کا فائدہ صرف اس صورت میں ہے جب اس کی طلب اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور حصول کا مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب اور سعادتِ اُخروی ہو۔

سطورِ بالا کی روشنی میں اگر ہم وطن عزیز کے دینی اور سیکولر دونوں قسم کے مدرسوں اور جامعات کی صورت حال کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ صورت حال بڑی مخدوش اور خوفناک ہے اور ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ جدیدیت اور لبرل ازم کے افکار اور کمرشل ترجیحات سے ہماری درسگاہوں میں تعلیم کا معیار دن بدن روبہ زوال ہے۔ سائنس اور تکنیکی علوم کا معاملہ ذرا مختلف ہے (اگرچہ وہ بھی ہمارے نقطہ نظر سے نیوٹرل اور value-free نہیں ہوتے۔) لیکن ماڈرن سوشل سائنسز اور سماجی علوم جو اکثر و بیشتر مغرب کی پروردہ اور الحاد اور کیپٹل ازم کے بطن سے تولد ہوئی ہیں' نے ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد کے اذہان کو دین و مذہب اور اس کی متوارث روایت سے بالکل برگشتہ کر دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی ایلیٹ یونیورسٹیاں ابھی تک کولونیل دور کی سامراجی پالیسیوں

پر چل رہی ہیں اور صرف انگریزی زبان ہی نہیں بلکہ مختلف سماجی علوم میں نظریات اور افکار بھی وہ پڑھا رہی ہیں جو ہمارے طالب علموں کو اپنی علمی روایت اور شاندار ماضی سے نہ صرف بالکل ناواقف رکھتی ہیں بلکہ انہیں اپنی تہذیب وتمدن اور اس کی اساسات کے حوالے سے شدید ذہنی احساسِ کمتری (inferiority complex) میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ سیکولر سماجی علوم میں انسان کے لیے جو آئیڈیل پیش کیا جاتا ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ لذتوں سے متمتع ہونے کا optimum method کون سا ہے۔ قومی سطح پر اس لذتیت پرست فلسفہ حیات اور بالکل آزاد اور مادہ پرستانہ معاشی تگ ودو (rat race) کے انتہائی بھیانک اثرات ہم اپنے معاشرے میں بڑے پیمانے پر دیکھ رہے ہیں۔ جنسی درندگی وشہوت پرستی اور تمام اخلاقی حدود سے ماورا دولت اور عیاشی کے ذرائع کا حصول مغربی فکر اور طرزِ معاشرت کے دلدادہ حضرات وخواتین کا واحد مقصد حیات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ برصغیر کے استعماری دور میں لارڈ میکالے کا تجویز کردہ تعلیمی پروجیکٹ آزادی کے قریباً پون صدی بعد تک ہماری نام نہاد ''اسلامی جمہوریہ'' میں جاری و ساری ہے اور برگ وبار لا رہا ہے۔ ہم نے نہ صرف کولونائزر کی زبان کو مقامی زبانوں اور قومی زبان پر سرکاری سطح پر برتر رکھا ہے' بلکہ اس زبان کے ساتھ آنے والی اقدار' افکار اور رویّوں کو بھی ترجیح دی اور سماجی حیثیت کی علامات کے طور پر ذہناً مقدم رکھا ہے۔ اور اس کی وکالت اور تشہیر ہمارا پرنٹ میڈیا' ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا بڑے مؤثر اور رنگین انداز میں کرتے ہیں۔ نیوکولونیل اور نیوامپیریلسٹ عالمی فکر کے مطابق مغربی (یورپ اور امریکہ) افکار اور تہذیب وکلچر کو عالمی سطح پر فوقیت اور مرکزیت حاصل ہے۔

لاہور کی ایک فاضل خاتون مریم سکینہ جو دینی علم کے ساتھ ساتھ شعائر اسلام (مثلاً حجاب) کی پابندی کرتی ہیں'☆ اپنے تجربات بیان کرتی ہیں اور شاکی ہیں کہ Cambridge International Examination (CIE) کے پاکستان سٹڈیز (تاریخ) کے مضمون کے نصابات میں پاکستان اور ساؤتھ ایشیا ریجن کے معروضی اور زمینی حقائق اور سامراجی طاقتوں کی زیادتیوں پر مبنی اہم تاریخی واقعات کا قطعاً کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ سوشیالوجی کے مضمون میں ابن خلدون اور دوسرے مسلم فضلاء کے عمرانی خیالات کا ذکر بالکل غائب اور تمام عمرانی افکار کا ماخذ اور آغاز یورپی تحریک تنویر (Enlightenment) کو قرار دیا جاتا ہے۔ راقم قارئین سے درخواست کرتا ہے کہ وہ محترمہ مریم سکینہ کا ''Decolonizing Education'' کے عنوان سے لکھا ہوا مختصر مضمون ضرور پڑھیں جو ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' (شمارہ نمبر ۲۹) میں حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ وقیع اور تجزیاتی تحریر خاص طور پر اُن والدین کے لیے چشم کشا ہوگی جن کے نوعمر بچے سماجی سٹیٹس کے دباؤ کے تحت مشہور اور مہنگے انگلش میڈیم سکولوں میں زیر تعلیم ہیں اور ان میں دی گئی تعلیم طلبہ اور طالبات کو اپنے دین ومذہب اور درخشندہ تاریخ سے بالکل ناواقف رکھ کر ذہنی طور پر کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ راقم کا احساس ہے کہ ہم بطور ملّت اس وقت حد درجہ پُرآشوب اور قیامت آثار دور سے گزر رہے ہیں۔ تشکیک اور الحاد کے مرض میں پڑھے لکھے نام نہاد مسلمانوں کی بڑی تعداد مبتلا ہے۔ چند رسوم کو

☆ اور جو خود GCE/IGCSE سسٹم اور نصابات میں پڑھی ہیں اور پھر M.Phil کے لیول تک انٹرنیشنل ریلیشنز میں تعلیم یافتہ ہیں' اور طویل عرصہ خود انگریزی میڈیم اداروں میں سوشل سائنسز کے مضامین کی تدریس کی ہے۔

بغیر حقیقی فہم اور بے جان انداز میں ادا کر کے وہ بڑی مشکل سے ''کلچرل مسلم'' کہلانے کے لیے کوالیفائی کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بعض اسلام پسند، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے علم اور تعلیم و تدریس کے موضوع پر خاصا کچھ لکھا ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر شاہد صدیقی صاحب کا ہے جو لاہور کی کئی اہم درسگاہوں میں تدریسی تجربے کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور وہاں سے ریٹائر ہوئے۔ میرے علم میں تعلیم کے موضوع پر ان کی کوئی مبسوط کتاب تو نہیں، لیکن گزشتہ آٹھ دس ماہ کے دوران متعدد اخباری کالموں میں انہوں نے اپنے خیالات و تجزیے پیش کیے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا ویسٹرن مراجع کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور انہوں نے برصغیر میں فرنگی اقتدار کے دو ہتھکنڈوں کے بارے میں بالکل صحیح اور تفصیل سے لکھا ہے کہ ایک طرف جہاں برطانوی استعمار نے جبر کے ہتھکنڈوں سے جسم تسخیر کیے وہیں تعلیم کے ذریعے لوگوں کو ذہنی اور کلچرل غلامی کے جال میں پھنسایا۔ اطالوی دانشور انتونیو گرامچی کے حوالے سے وہ وضاحت کرتے ہیں کہ بالادستی کے لیے پولیٹیکل سوسائٹی اور سول سوسائٹی دونوں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اوّل الذکر طاقت کا استعمال کرتی ہے جبکہ سول سوسائٹی طاقت کے استعمال کے بغیر ذہنوں کو تسخیر کرتی ہے۔ اس میں تعلیم ذہنوں پر قابو پانے کا ایک مضبوط ذریعہ بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کی تحریریں اس حد تک تو مفید ہیں کہ وہ تعلیمی اداروں کے لیے اس ہدف کے تو ناقد ہیں کہ ان سے ایسے طلبہ نکلیں جن کا مطمحِ نظر صرف ملازمت کا حصول اور معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں شامل ہونا ہو، اور وہ تہذیبِ نفس اور معاشرے کی بہتری کے جذبے سے بالکل خالی ہوں۔ وہ اس ضمن میں کریٹیکل تھنکنگ کی مہارت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں نئے مسائل کے حل کے لیے پرانے حل متروک ہو چکے ہیں، اور مسائل کا نئے زاویوں سے جائزہ لینا ضروری ہے اور تسلیم شدہ باتوں کو من و عن ماننے کے بجائے ان پر سوالات اٹھانے ضروری ہیں۔ تاہم دینی خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کا ذہن ان تحریروں میں قرآن و سنّت، عقائد اور مسلمان مشاہیر سے ملنے والے تراثِ علمی کی طرف نہیں گیا جس کی سطحی تدریس بھی ہمارے تعلیمی اداروں میں نہ ہونے کے برابر ہے اور طلبہ کے اخلاقی و روحانی وجود میں مثبت تبدیلی (Transformation) کا رول کسی درجے میں بھی ادا کرنے سے قاصر ہے۔ کریٹیکل اور ناقدانہ نظر سے پہلے ہماری نوجوان نسل میں دین و مذہب کے ثوابت اور یقینی امور کا علم اور ذہنی و قلبی وابستگی از حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی تنقیدی نگاہ صرف منفی اثرات پیدا کرے گی۔ کلاس روم سے باہر نوجوان نسل میڈیا سے اثر قبول کرتی ہے، اور بظاہر سچ کا یہ بیوپاری میڈیا غیر جانبدار (neutral) نہیں ہے بلکہ مکمل جانبدار ہے۔ یہ صرف اور صرف آزادی کے عقیدے کی وکالت کرتا ہے اور یہ میڈیا 'دین' اور 'اخلاق'، 'مذہب'، 'روایت'، 'اقدار' اور اجتماعیتوں/ عاقلہ سب کا مشترکہ دشمن ہے۔

بحمد اللہ اُمّتِ مُسلمہ کی تاریخ میں علوم دینیہ کو اپنی اصل سپرٹ اور مفہوم میں پیش کرنے کے لیے حق تعالیٰ کی طرف سے انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ احیائے دین اور مسلم فکریات کو روشن اور جاری رکھنے کے عمل میں سینکڑوں مشاہیر اہلِ علم نے حصّہ لیا، جن میں سے بعض کو اپنی بصیرت و تفقّہ اور جامعیت کے سبب خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس سنہری زنجیر میں دو نام بہت ہی نمایاں ہیں: امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ راقم اس مختصر شذرے میں صرف اوّل

الذکر کے بارے میں چند سطور قلم بند کر رہا ہے۔

حجۃ الاسلام امام ابوحامد غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) کی عربی تصنیف ''احیاء علوم الدین'' ان کی بیسیوں کتابوں میں سے اہم ترین مشہور زمانہ اور زندۂ جاوید کتاب جو کسی تعارف کی محتاج نہیں' اہلِ علم کے ہاں معروف ہے۔ یہ عقائد' اَسرارِ شریعت وطریقت' اخلاق وتصوّف' فلسفہ و مذہب' حکمت وموعظت' اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کا ایسا حسین شاہکار ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ پوری کتاب (اصل عربی اور تراجم بھی) ایسے مؤثر اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے کہ کوئی شخص اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کتاب کو ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں قبولِ عام رہا ہے۔ بے شک یہ کتاب اپنی خصوصیات میں بے نظیر و بے مثال ہے۔ اہلِ سُنّت کے عقائد اور بیانیے کا کینن (Canon) بننے والی ضخیم کتاب امام غزالیؒ کی احیاء العلوم ہی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ انسائیکلوپیڈک کتاب اسلام کا ایک انتہائی معقول' دلکش' جامع اور عظیم الشان بیانیہ ہے جو مغربی جدیدیت سے کم وبیش پانچ صدیوں قبل لکھا گیا۔ لیکن اس کے موضوعات اور مندرجات کی اہمیت (relevance) اور افادیت آج کے دور کے لیے بھی ہے۔ امام غزالی کی دینی حقائق میں گہری بصیرت' بالغ نظری' غیر معمولی ذہانت اور بے کنار تخلیقی استعداد ہر باب اور ہر فصل میں عیاں ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کو ایک طرف تو ائمہ اسلام الہاماتِ ربانی سمجھے' دوسری طرف ہنری لوئیس نے ''تاریخ فلسفہ'' میں اس کی نسبت یہ لکھا:

> ''اگر ڈیکارٹ (جو یورپ میں فلسفہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے) کے زمانے میں احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہو چکا ہوتا تو ہر شخص یہی کہتا کہ ڈیکارٹ نے احیاء العلوم کو چرا لیا ہے۔''

مقام حیرت ہے کہ امام غزالیؒ جن کی سو کے لگ بھگ انتہائی قیمتی اور فکر انگیز موضوعات پر تصنیفات ہیں اور جن میں احیاء علوم کا پہلا باب علم کے بیان اور اس کی فضیلت اور پھر آخری ابواب میں سے ایک 'بیان فی شرف العقل' ہے' ان پر عقل دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے علماء آخرت کو علمائے دنیا اور علمائے بد سے ممتاز کیا ہے' اور اسی طرح عقل معاد کو عقل معاش سے علیحدہ کیا ہے' اور علم کے لیے ادب واخلاق اور اخلاصِ نیت کو بھی ضروری قرار دیا ہے' لیکن یہ سب تصریحات قرآن وسُنّت اور روایت سے مستفاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ احیاء علوم کے ہر باب کا آغاز آیاتِ قرآنیہ' احادیث اور روایات کے بیان سے کرتے ہیں۔ غزالیؒ نے قرآن مجید کے فطری اور سادہ طرزِ استدلال کو اجاگر کیا ہے' جس کو ان کے خیال میں فلاسفہ اور عقلاء نے بگاڑ کر جدل اور ممارات کا دروازہ کھول دیا' جبکہ فی الحقیقت 'قلب' توحید کا معدن اور منبع ہے۔ اقوالِ لسان اور عملِ جوارح کی طرح اقوال القلب اور اعمال القلب 'عبادت' کی تشریح وتنقیح میں اہمیت کے حامل ہیں۔ جملہ مراسمِ عبودیت میں اصل حقیقت اعمالِ قلوب مثلاً اخلاص' انابت' خشوع وخضوع' تبتّل اور خشیت کی ہے۔ قرونِ اولیٰ والی عبادت کی جامعیت اور ماثور روایتی تعبیر ابھی اُمّتِ مُسلمہ کے اذہان میں واضح اور روشن تھی' چنانچہ چند صدیوں بعد مغلوبیت اور استعمار کے گہرے منفی اثرات والی صورت حال ابھی سامنے نہ آئی تھی۔ اس میں کسی کو بھی شک نہ تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبّت اُس (تعالیٰ) کی شریعت پر عمل کرنے سے متحقق ہوگی۔ اور چونکہ نظام اجتماعی پر بھی اہلِ حق غالب تھے' اسی لیے تعبیر دین میں بھی نئی

شکلیں (variants) یا اختلافی آراء سامنے نہیں آئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امام غزالیؒ کی جامع اور گمبھیر شخصیت میں کلامی، استدلالی (فلسفیانہ)، صوفی، فقہی اور روایتی، غرضیکہ تمام جہتیں اکٹھی جمع تھیں اور ایک اعتبار سے وہ یکتا اور منفرد شخصیت تھے جس کے سبب انہیں اُمّت نے حجۃ الاسلام کا لقب دیا۔

امام غزالیؒ کی شخصیت اور افکار سے عالَمِ اسلام کے علمی اور راسخ العقیدہ حلقے ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ یورپ اور امریکہ کی اکیڈیمیا کے پروفیسر حضرات نے بھی نہ صرف ان میں دلچسپی لی، بلکہ انہیں اپنے مطالعات اور ریسرچ کا موضوع بنایا۔ علاوہ ازیں متعدد نومسلم جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد قرآن وحدیث، اسلامی علوم اور عربی زبان ولٹریچر کے مطالعے میں طویل عرصے سخت محنت کی، ان میں سے بھی اکثر نے امام غزالیؒ کی تصنیفات میں بہت دلچسپی لی اور ان پر انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں تحقیقی کام کیا۔ ان میں عمر فاروق عبداللہ، عبدالحکیم مراد، حمزہ یوسف اور کئی دوسرے بہت نمایاں ہیں۔ چنانچہ احیاءِ علوم جہاں مدارس کے تعلیم یافتہ افراد کے لیے دورِ جدید کے فتن، کفر والحاد اور تشکیک وارتیاب کو سمجھنے میں معاون ہے وہاں جدید تعلیم یافتہ افراد کے لیے 'علم الکلام' کے اصول، منہج اور مباحث سے تعارف کا بھی عمدہ ذریعہ ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر عمر فاروق عبداللہ کے لیکچرز میں قرآن وحدیث کے مسلسل حوالے گہری مذہبیت کی ایک تابندہ علامت ہیں۔ عقائد کے مباحث میں ان کے ہاں تدقیق اور تعمق اور ساتھ ہی ظاہری وضع قطع اور لباس میں اسلامیت مسحور کن ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ مغرب روحانیت سے اب بہت دُور اور خالی (Spiritually unmusical) ہے، لیکن وہاں مذہبی اور روحانی موضوعات پر بڑے پیمانے پر لٹریچر چھپ رہا ہے اور بک شاپس کے علاوہ لائبریریوں میں بھی مطالعے کے لیے موجود ہے۔

افکارِ غزالیؒ کا بنظرِ غائر مطالعہ کسی اعتبار سے بھی منجمد تصوّرات کو قارئین میں منتقل نہیں کرتا، بلکہ قلبِ سلیم میں موجود حکمت خالدہ کے نکات شعور کی سطح پر ابھار کر انسان کے اخلاقی اور روحانی وجود کو اسلام کے قرنِ اوّل کی زندہ روایت کی شکل میں بلند کرتا ہے اور علم حقیقی اور اقدار کی بازیافت فراہم کرتا ہے۔ لیکن افسوس وقلق کے ساتھ اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ''مدرسہ ڈسکورس'' کے مؤسس اور روحِ رواں پروفیسر ابراہیم موسیٰ جنہوں نے جدیدیت اور پس جدیدیت کے منفی انداز اور بے معنی بلکہ تباہ کن وادی کو جو ذہنی جولانگاہ بنالیا ہے، انہیں امام غزالیؒ کی تصنیفات ایک حنوط شدہ مردہ روایت کی بازگشت محسوس ہوتی ہیں۔ نارتھ کیرولینا پریس کی طرف سے ۲۰۰۵ء میں شائع شدہ اپنی کتاب Ghazali and the Poetics of Imagination میں وہ اس رائے کا اظہار Mummification of Tradition کے الفاظ سے کرتے ہیں جو ہر اعتبار سے اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالوں پر محیط شاندار اور زندہ ومتحرک تسلسل وروایت پر انتہائی مضحکہ خیز اور ناروا، غلط اور طفلانہ تبصرہ ہے۔

قارئین حکمتِ قرآن کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ قرآن اکیڈمی کے سکالر اساتذہ ڈاکٹر رشید ارشد اور مؤمن محمود —— دونوں نے امام غزالیؒ سے وسیع علمی اخذ واکتساب کیا ہے۔ یہ عربی زبان کے جوہر شناس، عقائد اور عقل ونقل میں اختلاف اور تطبیق وترجیح کے مباحث میں دلچسپی رکھنے کے ساتھ امام غزالیؒ کا دینی مصلح اور راہنما کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں اساتذہ کا علم، فہم اور خوش بیانی حیرت انگیز ہے۔ (باقی صفحہ 21 پر)

مِلاکُ التأوِیل (۲۶)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃ یُونس

(۱۶۰) آیت ۱

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ①﴾

سورۂ لقمان میں ارشادفرمایا:

﴿الٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ②﴾

اورسورۂ یوسف کے آغاز میں ارشادفرمایا:

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ①﴾

ان تینوں سورتوں کے آغاز میں حروفِ مقطعات کے بعد کتاب اللہ کی آیات کا ذکر ہے۔ پہلی دوسورتوں میں حکمت سے بھرپور کتاب کہا گیااورسورۂ یوسف میں کھلی کھلی کتاب کہا گیاتواس فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۂ یونس اورسورۂ لقمان میں اُن نشانیوں کا کثرت سے ذکر ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اورتمام چیزوں کی بناوٹ میں مہارتِ تامّہ کاظہوردکھائی دیتا ہے جوکہ سورۂ یوسف میں اس انداز میں نہیں بیان کیا گیا۔

اب ذراسورۂ یونس کے مضامین ملاحظہ ہوں۔ زمین وآسمان کی خلقت کامضمون باربار بیان ہورہا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ (آیت ۳)

’’بے شک تمہارا ربّ وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔‘‘

زمین وآسمان کی نشانیاں اس کائنات کی عظیم نشانیوں میں سے ہیں کہ جن میں غورکرنے سے عبرت حاصل ہوتی ہے اوراس بات کا تذکرہ دوسری سورتوں میں بھی ہے۔ جیسے سورۃ غافر میں ارشادفرمایا: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ (آیت ۵۷) ’’بے شک آسمانوں اورزمین کی پیدائش لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔‘‘ اورسورۃ الجاثیہ میں ارشادفرمایا: ﴿اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ③﴾

’’بے شک آسمانوں اورزمین میں مؤمنوں کے لیے نشانیاں ہیں۔‘‘

اور پھر سورۂ یونس میں آسمان سے متعلق چند اور نشانیوں کا تذکرہ کیا گیا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ؕ﴾ (آیت ۵) ''وہی (اللہ) ہے جس نے سورج کو ضوفشاں بنایا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کے لیے منزلیں بنا دیں تاکہ تم سالوں کا عدد جان سکو اور حساب کتاب کر سکو۔'' اس سے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝﴾ ''بے شک رات اور دن کے آنے جانے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے' ان میں نشانیاں ہیں ایسی قوم کے لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہوں۔'' اور اس طرح اس ساری سورت میں جا بجا سامانِ عبرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

درمیان میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے لیکن وہ بھی بہت اختصار کے ساتھ۔ اس کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام کے اس قول سے ہوتا ہے:

﴿اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْكِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝﴾

''جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر میرا یہاں رہنا اور اللہ کی نشانیوں کا یاد دلاتے رہنا تم پر گراں گزرتا ہے تو پھر جان لو کہ مَیں نے اللہ ہی پر بھروسہ رکھا تو پھر تم اپنی تدبیر بھی پختہ کر لو' اپنے شرکاء کو بھی اکٹھا کر لو' اور پھر جو تم نے کرنا ہے وہ تم پر پوشیدہ نہیں ہونا چاہیے' اور تم نے پھر جو کرنا ہے وہ میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے مہلت تک نہ دو۔''

اور اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اللہ میرے ساتھ ہے' وہی میرا حامی و ناصر ہے' تم اور تمہاری تدبیریں میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں' نہ ہی تمہارے شریک ساتھی میرے خلاف کچھ کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات پر بھی جھاڑ پلائی کہ جن سہاروں پر تمہارا اعتماد ہے وہ نہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہ ہی نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذکر کیا کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو کشتی میں سوار کرا کر طوفان سے بچا لیا اور ان کے دشمنوں کو غرق کر دیا۔ ان کا مکر و فریب ان کے کسی کام نہ آیا۔

گویا اس سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس قصے کو جوڑ دیا جو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اور یوں اس سورت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی بیان ہوا ہے' جس میں بھی عبرت کے پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ فرعونیوں کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کا ذکر ہے: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ﴾ (آیت ۸۸) ''اے میرے ربّ! ان کے اموال کو نیست و نابود کر دے۔'' اور پھر نتیجتاً فرعون کا سمندر میں اپنے لاؤلشکر کے ساتھ غرق ہونا' موت سے قبل ایمان کا اقرار کرنا' یہ کہنا کہ:

﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾

''مَیں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اُس معبود کے جس پر بنی اسرائیل کا ایمان ہے اور مَیں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

لیکن عین موت کو دیکھ کر ایمان لانا اُس کے کسی کام نہ آیا۔ اور یہاں بھی اس قصے کے انہی پہلوؤں کو بیان کیا گیا جو بلحاظِ عبرت و نصیحت اس سورت کے مضمون سے مناسبت رکھتے تھے۔

اور اب کچھ سورۃ لقمان کا بھی ذکر ہو جائے۔ اس سورت کے مضامین بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت سے بھرپور نشانیوں کے غماز ہیں۔ شروع ہی میں آسمان و زمین کی پیدائش کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (آیت ۱۰) ''اُسی نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا کیا ہے جنہیں تم نہیں دیکھتے ہو''۔ اس کے بعد زمین کا ذکر کیا کہ جس میں پہاڑ اس طرح گڑے ہوئے ہیں کہ اس کا توازن برقرار رکھیں' آسمان سے پانی برسانے کا ذکر کیا کہ جو ہر طرح کی فصلوں کے پروان چڑھنے کا سبب ہیں' پھر کُفّار کو مخاطب کر کے کہا: ﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾ (آیت ۱۱) ''یہ تو اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ہے' اب مجھے دکھاؤ اُس کے سوا کسی دوسرے کی مخلوق؟'' اور پھر چند آیات کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ (آیت ۲۰) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے اور پھر اُس نے تمہارے اوپر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں نچھاور کر رکھی ہیں۔'' اور پھر انہیں یاد دلایا: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (آیت ۲۵) ''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے!'' اور پھر فرمایا کہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (آیت ۳۴)۔ ان آیات کے ضمن میں حضرت لقمان اور انہیں عطا کی جانے والی حکمت سے بھرپور تعلیمات کا تفصیلی تذکرہ کیا' تو اس سورت سے کتاب حکیم کا تعلق پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔

اور جہاں تک سورۂ یوسف کا تعلق ہے تو ساری سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی مفصّل حکایت ہی بیان ہوئی ہے کہ کیسے ان کے بھائیوں نے انہیں کنویں میں ڈالا' پھر کیسے وہ اپنے باپ سے ایک طویل عرصے کے لیے جدا ہو گئے' پھر مصر میں فتنے میں ڈالے گئے اور اس سے چھٹکارا حاصل کیا' پھر جیل میں ڈالے گئے اور اس کے بعد اعزاز و اکرام سے نوازے گئے اور بالآخر والد سمیت تمام خاندان سے دوبارہ ملا دیا گیا۔ ساری سورت اسی ایک مضمون کے گرد گھومتی ہے' اس لیے بالکل مناسب تھا کہ یہاں ''اَلْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ'' کے بجائے ''اَلْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ'' کہا جاتا۔ اور یوں ظاہر ہو گیا کہ پہلی دو سورتوں میں کتاب کے ساتھ ''حکمت'' کا اور تیسری سورت میں ''بیان'' کا وصف کیوں لایا گیا ہے۔

البتہ ایک سوال ابھی بھی تشنہ رہ جاتا ہے کہ سورۂ لقمان گو سورۂ یونس کے مضامین سے مشابہت رکھتی ہے لیکن اس کا آغاز ''الٓمّٓ'' سے ہوا ہے جبکہ سورۂ یونس کا آغاز ''الٓرٰ'' سے ہوا ہے۔ ایک میں حرف میم ہے اور دوسری

میں حرف ''ر'' تو اس کا سبب کیا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ سورۂ لقمان میں جس انداز سے مؤمن اور کافر دونوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا بیان ہوا ہے وہ انداز سورۂ یونس میں نہیں اپنایا گیا گو سورۂ یونس' سورۂ لقمان کے مقابلہ میں طوالت رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو کہ سورۂ لقمان میں آسمان و زمین کی نشانیوں کا بیان ہوا اور اس کے بعد چیلنج کے طور پر کہا گیا کہ یہ کچھ تو اللہ کا پیدا کردہ ہے' تو پھر دکھاؤ کہ تم اللہ کے سوا جن کی پوجا کرتے ہو' انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ سورۂ یونس میں اس موضوع کی طرف ایک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے' فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ﴾ (آیت ۳۴)

''کہہ دیجیے: کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جس نے مخلوقات کو پہلے پیدا کیا ہو اور پھر وہ اس کا اعادہ بھی کر رہا ہو؟''

لیکن سورۂ لقمان میں اس موضوع کو اور زیادہ نکھارا گیا ہے' وہاں آیات کا اختتام بھی سورۂ یونس کی آیات سے مختلف ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت وعید کا ذکر کیا گیا ہے وہاں پھر نبی اکرم ﷺ کی دلجوئی کے لیے یہ الفاظ بھی کہے گئے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ﴾ (آیت ۲۳) ''اور اگر پھر کوئی کفر کرتا ہے تو اس کا کفر آپؐ کو رنجیدہ نہ کرے۔'' اور مزید تسکینِ قلب کے لیے کہا کہ ''اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ان کا جواب ہوگا: اللہ (ہی نے پیدا کیا ہے)۔'' (آیت ۲۵) اور یہ اس لیے کہا گیا کہ اللہ کے رسول جان لیں کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی تقدیر سے ہو رہا ہے' وہ اللہ کے سابق علم کے مطابق ہو رہا ہے اور یہ کہ اللہ اپنے ہر ہر فعل میں حکمت والا ہے۔ اور پھر اہلِ ایمان کو (جن کے خوش بختی مقدر ہو چکی ہے) ان آیات سے توجہ دلائی گئی: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ﴾ (آیت ۲۰) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور تمہارے اوپر اپنی نعمتیں' ظاہری بھی اور باطنی بھی' نچھاور کر دی ہیں۔'' اور پھر دوسری دو آیات میں بھی انہی کلمات تنبیہہ (اَلَمْ) کو دہرایا گیا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ (آیت ۲۹) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے'' اور فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۳۱) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ کشتی اللہ کی نعمت کے ساتھ سمندر میں رواں دواں ہے۔''

یہ حروفِ تنبیہہ جس میں حرفِ میم نمایاں ہے' اس سورت میں تین مرتبہ استعمال ہوئے اور اس تکرار کے ساتھ کسی دوسری سورت میں استعمال نہیں ہوئے' سوائے سورۂ فاطر کے جو سورۂ لقمان سے زیادہ طویل ہے' لیکن وہاں بھی یہ حروف صرف ایک دفعہ لائے گئے ہیں' تو اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ سورۂ لقمان کے آغاز میں بجائے ''الٓرٰ'' کے ''الٓمّٓ'' لایا جائے جس میں حرفِ میم پر زور دیا گیا ہے۔

اور اب ملاحظہ ہو سورۂ یونس جس کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ

رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ﴾ (آیت ۳) ''بے شک تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا'' اور پوری سورت میں تیرہ (۱۳) مقامات پر کلمہ ''ربّ'' کی تکرار کی گئی۔ یہ تو پہلی آیت تھی جس کا ذکر کیا گیا اور آخری آیت یہ ہے: ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۰۸) ''کہہ دیجیے کہ اے لوگو! تمہارے ربّ کی طرف سے حق تمہارے پاس آچکا ہے۔'' اس کے بالمقابل سورۂ لقمان میں صرف ایک جگہ ''ربّ'' کا ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ﴾ (آیت ۳۳) ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو! اور اُس دن سے ڈرو جبکہ کوئی باپ اپنے بچوں کے کام نہ آسکے گا۔''

اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ سورۂ یونس میں کوئی ۲۲۰ ایسے کلمات ہیں جن میں حرف ''راء'' کی تکرار ہوئی ہے' اور اس کے مماثل سورۃ النحل ہے جو سورۂ یونس سے زیادہ طویل ہے لیکن اس کے آغاز میں حروفِ مقطعات نہیں ہیں۔ اس سورت میں وہ کلمات جن میں حرفِ راء آیا ہے تقریباً دوسو کے قریب ہیں' اور اس لحاظ سے یہ کہنا بجا ہے کہ سورۂ یونس کے آغاز میں ''الٓرٰ'' اور سورۂ لقمان کے آغاز میں ''الٓمّٓ'' لانا بالکل مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

(۱۶۱) آیت ۱۸

﴿وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ﴾

''اور وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نفع۔''

اور سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا:

﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾﴾ ''کیا تم اللہ کے سوا اُن کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔''

اور سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا: ﴿وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ﴾ (آیت ۵۵) ''اور وہ اللہ کے سوا اُن کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔''

تو سوال یہ ہے کہ سورۂ یونس میں نقصان کا ذکر پہلے ہے اور نفع کا بعد میں' جبکہ باقی دونوں سورتوں میں اس کے برعکس ہے؟

ملاحظہ ہو کہ سورۂ یونس میں اس قول کے فوراً بعد مشرکین کا یہ قول نقل کیا گیا: ﴿وَیَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہوں گے''۔ گویا اندازِ بیان یوں ہے کہ ''وہ اللہ کے سوا اُن کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نفع'' اور سمجھتے یہ ہیں کہ یہ انہیں نفع پہنچائیں گے اور اللہ کے ہاں ان کی سفارش کر سکیں گے۔ تو چونکہ بعد میں ایک ایسے عامل کا تذکرہ کیا جا رہا تھا جو ان کے خیال میں نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا تھا تو اس عامل سے معاً قبل نفع کا ذکر کرنا ہی مناسب تھا۔

اب رہی سورۃ الفرقان کی آیت تو اس سے قبل وہ آفاقی نشانیاں بتائی جا رہی ہیں جن میں انسان کے لیے نفع

ہی نفع ہے۔ جس کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ﴾ (آیت ۴۵) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے ربّ نے کیسے سائے کو پھیلایا ہے؟'' پھر اس کے بعد ذکر ہے دن' رات اور نیند کے فوائد کا' ہواؤں اور بارشوں کے تصرفات کا' بے جان زمین کو زندہ کرنے کا' انسان اور حیوان کو پانی سے سیراب کرنے کا' دریا کے میٹھے اور سمندر کے کھارے پانی کا اور پھر ایک اور نفسی شہادت کا' فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾﴾ ''اور وہی (اللہ) ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور پھر اس سے سلسلہ نسب کو بھی جوڑا اور سسرالی رشتوں کو بھی' اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔ تو پھر بالکل مناسب تھا کہ ان نفع بخش نعمتوں کے بیان کے بعد معبودانِ باطل کے ذکر میں پہلے ان کے نفع نہ پہنچانے کا ذکر کیا جاتا اور پھر نقصان کا۔ اور اسی لیے ترتیبِ کلام یوں رکھا گیا: ﴿وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ﴾ گویا یہ کہا جا رہا ہے: ﴿اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ﴾ (النحل:۱۷) ''جو پیدا کرتا ہے کیا وہ اُس کی مانند ہو سکتا ہے جو پیدا نہیں کر سکتا؟''

(صاحبِ کتاب نے سورۃ الانبیاء کی آیت کی توجیہہ بیان نہیں کی لیکن اسے بھی اسی انداز میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس آیت سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بُتوں کو کلہاڑے سے توڑنے کا ذکر ہے سوائے ایک بُت کے' اور جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ تو اس بڑے بت نے کیا ہوگا! اور تم خود کیوں نہیں سوال کر لیتے اگر یہ بُت قوتِ گویائی رکھتے ہیں؟ گویا حضرت ابراہیمؑ انہیں یہ باور کرانا چاہ رہے ہیں کہ تمہارے یہ معبودانِ باطل جو اپنے آپ کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے وہ تمہیں کیا نفع پہنچائیں گے' اور یوں ان کا یہ کہنا بالکل مناسب تھا: ﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یَضُرُّكُمْ ۝﴾ (اضافہ از مترجم: ص ح)

(۱۶۲) آیت ۳۱

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾

''کہہ دیجیے! کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟''

اور سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (آیت ۲۴)

''کہہ دیجیے! کون ہے جو تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق عطا کرتا ہے؟''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیتوں کا مضمون اور معنی یکساں ہے تو پھر ایک جگہ السَّمَآء مفرد کے صیغے کے ساتھ اور دوسری آیت میں جمع کے صیغے کے ساتھ کیوں لایا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ یونس میں گو ''السَّمَآء'' اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے لیکن جو معنی مطلوب تھا وہ ادا ہو گیا ہے۔ سورۂ سبا میں ''السَّمَاء'' جمع کے صیغے کے ساتھ یعنی ''السَّمٰوٰتِ'' لایا گیا ہے اور اس میں پچھلی آیت کا لحاظ رکھا گیا ہے' فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾﴾

''کہہ دیجیے! اللہ کے سوا تم نے جو معبود بنا رکھے ہیں' ان کو پکار کے دیکھ لو' وہ تو آسمانوں اور زمین میں ذرّہ برابر کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی چیز میں ان کی شراکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔''

یہاں اللہ کے ساتھ ان کے مزعومہ شرکاء کی نفی کی گئی ہے اور پھر اس کے بعد مذکورہ آیت ہے' تو ایک آیت میں السَّمٰوٰت جمع کے صیغے کے ساتھ تھا تو دوسری آیت میں بھی اسی کی مناسبت سے جمع کے صیغے کے ساتھ لایا گیا۔

یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں ''السَّمٰوٰت'' جمع کے صیغے کے ساتھ کیوں لایا گیا جبکہ مفرد کے صیغے کے ساتھ بھی تو وہی معنی ادا ہو سکتا تھا؟ اور پھر اس میں اختصار کا پہلو بھی شامل ہو جاتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں شرکاء کے تصرفات کی بھی نفی کی گئی ہے' اور یہ کہ وہ کسی چیز کے کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اور جب نفی کی جائے تو اس میں مکمل نفی کرنے کے لیے عمومیت کا لحاظ کرنا ضروری ہے' تو یہاں ''السَّمٰوٰتِ'' کہا کہ وہ ذرہ برابر کسی چیز پر قادر نہیں ہیں' ایک آسمان کیا' سارے آسمانوں میں ان کا کوئی دخل نہیں' اور پھر اسی مناسبت سے اگلی آیت میں بھی ''السَّمٰوٰت'' ہی لایا گیا۔ سورۂ یونس میں یہ مناسبت نہ تھی اس لیے وہاں مفرد کے صیغے کے ساتھ لانا ہی مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

اضافہ از مترجم

السَّمَاء (مفرد) اور السَّمٰوٰت (جمع) کے درمیان فرق کو عصرِ حاضر کے امام عربی لغت ڈاکٹر فاضل صالح السامرائی نے بالکل دوسرے انداز سے واضح کیا ہے اور اس ضمن میں انہوں نے چند دوسری آیات کا انتخاب کیا ہے' ان کی رائے ملاحظہ ہو۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۴) ''کہا کہ میرا رب آسمان اور زمین میں قول کو جانتا ہے۔'' اور سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ (آیت ۶) ''کہہ دیجیے کہ (قرآن) کو اُس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین میں راز کو جانتا ہے۔'' پہلی آیت میں قول کے جاننے کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ السَّمَاء (مفرد) لایا گیا اور دوسری آیت میں راز کے جاننے کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ السَّمٰوٰت (جمع) لایا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ''راز'' کے مقابلے میں ''قول'' زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔ قول سری اور جہری دونوں طرح کی باتوں کو کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ السَّمَاء (مفرد) لایا گیا جو ''السَّمٰوٰت'' سے زیادہ وسیع معانی کو سمیٹے ہوئے ہے اور وہ اس لیے کہ السَّمَاء بطورِ جنس استعمال ہوا ہے تو اس کا اطلاق ان دو معانی پر ہوتا ہے:

(۱) ہر وہ چیز جو تمہارے اوپر ہو اُسے سماء کہا جائے گا تو اس میں سارے آسمان بھی داخل ہو گئے اور بادل' بارش'

فضاء بھی شامل ہو گئے۔ ارشاد فرمایا: ﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ (الرعد:۱۷) ''آسمان سے پانی نازل کیا۔''
سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ﴾ (آیت ۱۲۵) ''اور اللہ جس کو ہدایت دینا چاہے تو اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہے تو اس کے سینے کو تنگ اور مشکل کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان میں بدقت چڑھ رہا ہے۔'' اور سورۃ الحج میں اللہ سے ناامید انسان کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ﴾ (آیت ۱۵) ''جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اُس کی مدد نہ کرے گا تو وہ آسمان کی طرف ایک رسّی تان لے۔''
یہاں آسمان سے مراد چھت ہے جسے اوپر ہونے کی بنا پر سماء سے تعبیر کیا گیا۔
(۲) جنس سَمَاء کہہ کر اس سے آسمانوں میں سے ایک آسمان بھی مراد لیا جا سکتا ہے جیسے سورۃ الملک میں ارشاد فرمایا:
﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ (آیت ۵)
''اور ہم نے قریب ترین آسمان کو چراغوں سے سجا دیا۔''
سورۃ الحجر میں ارشاد فرمایا:
﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝۱۴﴾
''اور اگر ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں چڑھتے چلے جائیں۔''
اور آیئے اب دو آیات اور لے لیتے ہیں جن میں یہ فرق بخوبی واضح ہو جائے گا۔ یعنی یہ کہ ''السَّمَاء'' کا لفظ ''السَّمٰوٰت'' کے مقابلے میں زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد فرمایا:
﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۳﴾
''اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اُس جنّت کی طرف جس کی چوڑائی سارے آسمان اور زمین ہیں اور جو متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''
اور سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا:
﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ (آیت ۲۱)
''اور سبقت لے جاؤ اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف اور ایسی جنّت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی مانند ہے اور جسے ان لوگوں کے لیے تیار کیا گیا ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ اور یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔''
دوسری آیت کا مفہوم (جس میں السَّمَاء کا لفظ آیا ہے) پہلی آیت کے مضمون سے زیادہ وسعت رکھتا ہے کہ جہاں السَّمٰوٰت آیا ہے۔ اور اسے یوں واضح کیا جا سکتا ہے:

(۱) ''سَابِقُوْا'' (سبقت لے جاؤ) میں ''سَارِعُوْا'' (تیزی سے بھاگو) بھی شامل ہے اور پھر اس میں مزید آگے بڑھنے کا بھی رجحان پایا جاتا ہے۔

(۲) ''کَعَرْضِ السَّمَآءِ'' (آسمان کے عرض کی مانند) جس چیز سے تشبیہہ دی جاتی ہے وہ مشبہ سے زیادہ بڑی یا زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔

(۳) ''لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ'' کی تعبیر ''متقین'' کے مقابلہ میں زیادہ لوگوں کو شامل ہے۔

(۴) ''ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ'' یہ ایک مزید فضیلت کا بیان ہے جو آل عمران کی آیت میں بیان نہیں ہوا۔

تو ثابت ہوا کہ ''السَّمَاء'' کا لفظ ''السَّمٰوٰت'' سے زیادہ جامع ہے۔

(۱۶۳) آیت ۳۳

﴿کَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾

''اس طرح آپ کے ربّ کی یہ بات کہ یہ فاسق لوگ ایمان نہیں لائیں گے پوری ہو چکی ہے۔''

اور سورۃ المؤمن میں ارشاد فرمایا:

﴿وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۶﴾﴾

''اور اسی طرح آپ کے رب کی یہ بات کہ کفار ہی آگ والے ہیں پوری ہو چکی ہے۔''

یہاں دونوں آیات میں تین فروق ملاحظہ ہوں کہ جن کی وضاحت درکار ہے:

(۱) پہلی آیت میں ''کَذٰلِکَ'' سے پہلے حرفِ عطف ''و'' نہیں ہے اور دوسری میں ہے۔

(۲) پہلی آیت میں فاسقین کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں کُفّار کا۔

(۳) پہلی آیت میں فاسقین کے لیے کہا گیا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے اور دوسری آیت میں کُفّار کے لیے کہا گیا کہ وہ اصحابُ النّار ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ سورۂ یونس کی مذکورہ آیات سے قبل یہ آیات ذکر کی گئی ہیں:

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾

''کہہ دیجیے کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق عطا کرتا ہے؟''

﴿اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾

''یا کون ہے وہ جو تمہاری سماعت اور بصارت کا مالک ہے!''

﴿وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ﴾

''اور کون ہے جو مُردے سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردے کو نکالتا ہے؟''

﴿وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾

''اور کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے تو وہ کہیں گے ''اللہ''! تو پھر اُن سے کہیں کہ تم کیوں نہیں ڈرتے؟''

پھر ارشاد فرمایا:

﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾

''تو پھر یہی تو اللہ ہے تمہارا حقیقی رب! اور پھر حق کے بعد کیا رہ جاتا ہے سوائے گمراہی کے؟ تو پھر کہاں سے گھومے پھرے جاتے ہو؟''

یہاں ان لوگوں کا یہ اقرار بتایا جا رہا ہے کہ وہ رزق اور خلق دونوں کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتے ہیں' اور اگر ایسا ہے تو پھر اس پر ایمان لانے میں کیا امر مانع ہے؟ اور چونکہ ساری نشانیاں دیکھنے کے باوجود یہ ایمان نہیں لائے تو یہ کہنا مناسب تھا کہ ان کے بارے میں اللہ کا یہ حکم پورا ہوا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ واؤ العطف اس لیے نہیں لایا گیا کہ ان لوگوں کے ذکر سے پہلے ان جیسی کسی دوسری قوم کا ذکر نہیں کیا گیا جن پر کلمہ عذاب ثابت ہو چکا ہو۔ انہیں فاسق اس لیے کہا گیا کہ انہیں سمع و بصر کی نعمتیں عطا کی گئیں اور پھر انہوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار بھی کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ تصدیق یعنی ایمان لانے کی نعمت سے محروم رہے۔ گویا ان کا بھی وہی حال تھا جو سورۃ البقرۃ میں بیان ہوا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ (آیت ۱۶)

''یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدتے ہیں۔''

یعنی یہ لوگ ایمان لانے کے بہت قریب تھے لیکن ایمان لاتے لاتے رہ گئے۔ اس لیے ان لوگوں پر فسق کا لفظ زیادہ بہتر طریقہ سے صادق آتا ہے۔

اب آیئے سورۃ غافر (سورۃ المؤمن) کی طرف کہ جس کے آغاز ہی میں جھگڑالو کفار کا ذکر ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (آیت ۴) ''اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑا نہیں کرتے ہیں مگر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا''۔ اور پھر اس کے فوراً بعد نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر کیا اور بعد میں آنے والے گروہوں کا جنہوں نے اپنے زمانے کے ہر رسول کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی' حق بات کو باطل طریقہ سے دبانے کی سعی کی جس کے نتیجے میں وہ عتابِ الٰہی کا شکار ہوئے اور پھر یہ آیت لائی گئی: ﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۶﴾﴾ ''اور اس طرح تیرے ربّ کی بات کفر کرنے والوں پر ثابت ہو گئی اور یہ کہ وہ آگ میں جھونکے جانے کے قابل ہیں۔'' اور اگر ان کے حق میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا تو وہ ایمان کیسے لا سکتے تھے؟ یہ تو سُنّتِ الٰہی کے خلاف ہے' جیسے کہ سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا: ﴿اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور جس پر عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہے' تو کیا تم اُسے چھڑا سکو گے جو آگ میں ہے؟'' اب ملاحظہ ہو کہ یہاں چند اقوام کا ذکر ہوا ہے جن کے ساتھ اس سُنّتِ الٰہی کے مطابق معاملہ ہو چکا ہے' تو مناسب تھا کہ یہ الفاظ لائے جاتے: ﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ﴾ ''اور اس طرح ثابت ہو گیا....'' چونکہ سورۂ یونس میں اس آیت سے ماقبل ایسی کسی قوم کا تذکرہ نہ تھا جس پر کلمۂ عذاب ثابت ہو چکا ہوتا' اس لیے وہاں ''وَكَذٰلِكَ'' لانے کی ضرورت نہ تھی۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہاں ان کے کفر کا ذکر ہے' سورۂ یونس کی طرح فسق کا نہیں۔ اور وہ اس لیے کہ سورۂ غافر میں سورۂ یونس کی مانند ان نشانیوں اور سمع و بصر کی قوتوں کا ذکر نہیں کیا گیا جس سے عبرت حاصل کی جا سکتی

ہو۔ گو دونوں سورتوں کا مدّعا ایک ہے کہ کُفّار اور فاسقین دونوں پر اللہ کے عذاب کی مہر ثبت ہو چکی ہے‘ لیکن دونوں سورتوں کے اندازِ بیان میں فرق روا رکھا گیا ہے‘ سورۂ غافر میں آغازِ کلام ہی ﴿عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ سے ہوا تھا اس لیے كَلِمَةُ الْعَذَابِ کے بعد بھی ﴿عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ کے الفاظ لائے گئے۔ اور سورۂ یونس میں چونکہ عبرت حاصل کرنے کے ان تمام ذرائع کا ذکر کیا گیا تھا کہ جو ایمان لانے میں مددگار ہو سکتے تھے‘ لیکن لوگوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ فسق کے مرتکب ہوئے۔ فسق چھوٹی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے کہ صرف معصیت تک محدود رہے تو ایسا شخص پھر بھی دائرۂ ایمان میں رہ جاتا ہے‘ اور فسق بڑی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہو جائے اور کفر کا مرتکب قرار دیا جائے۔ سورۂ یونس میں مذکورہ لوگوں کا فسق‘ کفر کے مرتبہ کا تھا‘ کہ انہیں عبرت حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوئے لیکن انہوں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا‘ اس لیے ان پر بھی مہرِ عذاب ثبت ہو گئی۔

ہماری اس وضاحت سے تینوں سوالات کے جوابات نکھر کر سامنے آ گئے ہیں اور واضح ہو گیا ہے کہ ہر دو سورتوں کے مضامین اور الفاظ اپنی اپنی جگہ مناسبت رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم!

(۱۶۴) آیت ۵۵

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۵﴾

’’یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ حق ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔‘‘

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ﴾ (آیت ۶۶)

’’یاد رکھو اللہ ہی کے لیے ہے جو بھی ہے آسمانوں میں اور جو بھی ہے زمین میں‘ اور اللہ کو چھوڑ کر وہ کن شریکوں کی پیروی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔‘‘

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ۭ﴾ (آیت ۶۸)

’’اور انہوں نے کہا کہ اللہ نے اپنا ایک بیٹا بنا رکھا ہے‘ اللہ ان باتوں سے پاک ہے‘ وہ تو بے نیاز ہے‘ اس کے لیے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور وہ سب کچھ جو زمین میں ہے‘ تو کیا تمہارے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل ہے؟‘‘

یہاں دو سوال ابھرتے ہیں:

(۱) پہلی آیت میں ’’مَا فِي السَّمٰوٰتِ‘‘ کے بعد ’’مَا فِي الْاَرْضِ‘‘ نہیں کہا گیا صرف ’’فِي الْاَرْضِ‘‘ کہا

گیا' جب کہ تیسری آیت میں ''مَا فِی الْاَرْضِ'' کے الفاظ ہیں۔

(۲) دوسری آیت میں ''مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ'' لایا گیا یعنی ''مَنْ'' کا لفظ ہے بجائے ''مَا'' کے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت سے قبل فرمایا تھا: ﴿وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِی الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ﴾ (آیت ۵۴) ''اور اگر ہر جان کے لیے جس نے ظلم (بمعنی شرک) کیا ہے' وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اسے دے کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرے گی۔'' لیکن وہ ایسا نہ کر سکے گی کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ ﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ اب چونکہ اس آیت کا تعلق پچھلی آیت کے مضمون سے تھا جہاں لفظ ''مَا'' لایا گیا تھا تو یہاں بھی ''مَا'' لایا گیا اور چونکہ اس سے مقصود حاصل ہو رہا تھا اس لیے یہاں ''فِی الْاَرْضِ'' کے بجائے ''وَالْاَرْضِ'' لانا بھی کافی تھا۔ اور وہ اس لیے بھی کہ اگلی آیت (نمبر ۶۸) میں ''فِی الْاَرْضِ'' کہہ کر اس کی تکرار کی جانے والی تھی۔ اور اس تکرار کی وجہ یہ بنی کہ آیت ۶۸ کا آغاز کفار کے اس دعویٰ سے ہوتا ہے: ﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ ''انہوں نے کہا کہ اللہ نے (اپنے لیے) بیٹا بنایا ہے''۔ اور اس دعویٰ کی نفی کے طور پر کہا گیا کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے: ﴿هُوَ الْغَنِیُّ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ ''وہ تو بے نیاز ہے۔ اور اس کے لیے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور وہ سب کچھ ہے جو زمین میں ہے۔''

اور ملاحظہ ہو کہ قرآن میں جہاں مشرکین کا یہ قول آیا ہے وہاں سختی سے اس کی تردید کی گئی ہے اور اس کے بعد اللہ کے مالک ہونے کا وصف بیان کیا گیا ہے اور زمین و آسمان میں ہر چیز اس کی ملکیت قرار دی گئی ہے' مثال کے طور پر سورۂ مریم کی آیات ملاحظہ ہوں: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ (اللہ) الرحمٰن نے بیٹا (یعنی اولاد) بنا کر رکھا ہے''۔ اور پھر اس بات کی تردید ان سخت الفاظ کے ساتھ کی گئی: ﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾﴾ ''یقیناً تم بڑی بھاری چیز لے کر آئے ہو''۔ ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾﴾ ''قریب ہے کہ (اس قول کی بنا پر) آسمان پھٹ جائیں' زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں''۔ ﴿اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾﴾ ''کہ وہ رحمٰن کے لیے اولاد کا اثبات کر رہے ہیں۔'' ﴿وَمَا یَنْۢبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾﴾ ''اور رحمٰن کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اولاد بنا کر رکھے''۔ کیونکہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ اُس کی ملکیت میں ہے۔ ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾﴾ ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔'' یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ اولاد سے بے نیاز ہے' اُسے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے' اور اس لیے ﴿مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ کی تکرار کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا گیا۔

اب تیسرے سوال کی طرف آئیں' کہ آیت ۶۶ میں بجائے ''مَا'' کے ﴿مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ کا انداز کیوں اختیار کیا گیا؟ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس آیت سے ماقبل ملاحظہ ہو: ﴿وَلَا

یَحۡزُنۡكَ قَوۡلُهُمۡ ۘ﴾ (آیت ۶۵) ''ان کی بات تمہیں غمزدہ نہ کرے''۔ یہاں اللہ کے رسول ﷺ کو دلاسا دیا جارہا ہے' جیسے کہ سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا: ﴿قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ﴿۳۳﴾﴾ ''ہم جانتے ہیں کہ وہ جو بات کہہ رہے ہیں اس سے تم غمزدہ ہو جاتے ہو تو (جان لو) کہ یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلا رہے بلکہ یہ ظالم لوگ اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔'' یعنی تم اپنی جگہ سچے ہو' ان لوگوں کی پروا نہ کرو' یہ تو صرف حسد کا شکار ہیں اور اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں' لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے۔ اور سورۂ یونس کی آیت میں مزید ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ؕ﴾ (آیت ۶۵) ''بے شک تمام تر غلبہ تو اللہ ہی کے لیے ہے''۔ اس کے ساتھ اس میں اور کوئی شریک نہیں ہے' وہ مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے عزت و غلبہ سے بھی نوازتا ہے۔ ''جَمِيۡعًا'' کہہ کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا اور پھر کہا کہ ﴿هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ﴾ ''وہی سننے والا ہے وہی سب کچھ جاننے والا ہے۔'' یعنی وہ کچھ بھی کر لیں' جو چاہے مکر و فریب کر لیں' اللہ سب سنتا ہے اور جانتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر یہ آیت آئی:

﴿اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ ؕ﴾

''یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو بھی آسمانوں میں ہے اور جو بھی زمین میں ہے۔''

''مَنۡ'' سے اشارہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے زمین و آسمان کے لشکر ہیں کہ جن کے ذریعے وہ تمہاری مدد کرے گا' اور چونکہ رسولوں کی مدد ملائکہ اور اہلِ ایمان سے ہی کی جاتی ہے اس لیے ''مَنۡ'' کا لفظ لایا گیا جو عقلاء (انسان' جن' فرشتے) کے لیے استعمال ہوتا ہے' اور پھر ''مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ'' سے مضمون میں اور زیادہ تاکید کا پہلو غالب آ گیا۔

اور یوں واضح ہو گیا کہ ہر سہ آیات میں جو بھی الفاظ اور کلمات آئے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ بالکل مناسب ہیں اور اگر اس کا اُلٹ ہوتا تو غیر مناسب ہوتا۔ واللہ اعلم!

❁❁❁

بقیہ: حرفِ اوّل

ڈاکٹر رشید ارشد نے رجوع الی القرآن کورس پارٹ II کی کلاس میں احیاء علوم کے باب العلم' باب المراقبہ والمحاسبہ کے علاوہ چند اور ابواب کا عربی text کے ساتھ مطالعہ کروایا اور تشریح کی اور بہت سی فکری گمراہیوں اور دینی انحرافات کا تجزیہ علمی انداز میں کیا۔ رمضان المبارک میں تراویح کے بعد تقریباً ایک گھنٹے کے لیکچر باب الصبر والشکر پر On Line دیے جو ریکارڈ کیے گئے۔ انہوں نے تفہیم و تنقیدِ فکرِ جدید کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے ''غزالی فورم'' کا آغاز بھی کیا ہے۔ دعا ہے کہ دینِ متین کے احیاء کے لیے یہ علمی کاوشیں بارآور ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں شرفِ قبولیت سے نوازیں۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سورۂ ھود

آیات ۴۴ تا ۴۹

﴿وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۭ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾﴾

ب ل ع

بَلَعَ یَبْلَعُ (ف) بَلْعًا: کسی کو نگلنا۔

اِبْلَعْ (فعل امر): تو نگل۔ زیر مطالعہ آیت ۴۴

ق ل ع

قَلَعَ یَقْلَعُ (ف) قَلْعًا: کسی کو معزول کرنا، کسی سے کچھ چھین لینا۔

اَقْلَعَ (افعال) اِقْلَاعًا: کسی چیز یا کام کو چھوڑنا، رک جانا۔

اَقْلِعْ (فعل امر) :تو چھوڑ، تو رک جا۔ زیر مطالعہ آیت ۴۴

غ ی ض

غَاضَ یَغِیْضُ (ض) غَیْضًا :کم ہونا، سکڑنا (لازم)، کم کرنا، سکیڑنا (متعدی)۔ ﴿اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ﴾ (الرعد:۸) ''اللہ جانتا ہے اس کو جو اٹھاتی ہے ہر مادہ اور اس کو جو سکیڑتی ہیں بچہ دانیاں۔'' اور زیر مطالعہ آیت ۴۴

ج و د

جَادَ یَجُوْدُ (ن) جُوْدَةً: عمدہ ہونا، بہترین ہونا۔

جَوَّادٌ (صفت) :عمدہ، بہترین۔ (مذکر و مؤنث دونوں کے لیے) اس کی جمع انسان کے لیے اَجْوَادٌ اور گھوڑے کے لیے جِیَادٌ ہے۔ ﴿اِذْ عُرِضَ عَلَیْهِ بِالْعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ ۝۳۱﴾ (صٓ) ''جب پیش کیے گئے ان پر شام کو بہترین گھوڑے۔''

جُوْدِیٌّ (اسم نسبت): عمدگی والا۔

اَلْجُوْدِیُّ (اسم علم): ایک پہاڑی کا نام۔ زیر مطالعہ آیت ۴۴

ترکیب:

(آیت ۴۴) بُعْدًا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے، اس لیے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت ۴۶) ﴿اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ میں اِنَّ کا اسم ہٗ کی ضمیر ہے۔ لَیْسَ کا اسم اس میں شامل ضمیر ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ مِنْ اَهْلِكَ قائم مقام خبر ہے۔ ﴿اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ﴾ میں اِنَّ کا اسم ہٗ کی ضمیر ہے اور عَمَلٌ اس کی خبر ہے جبکہ غَیْرُ صَالِحٍ اس کا بدل ہے۔ یہاں ہٗ کی ضمیر کے لیے دو رائے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں بھی ہٗ کی ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے لیے ہے۔ ایسی صورت میں کہتے ہیں کہ عَمَلٌ یہاں پر دراصل ذُوْ عَمَلٍ کے معنی میں آیا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے لیے ہے۔ اس رائے کی تائید آیت کے اگلے جملے سے ہوتی ہے۔ اس لیے ترجمہ میں ہم دوسری رائے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت ۴۷) اِلَّا دراصل اِنْ لَا ہے اس لیے تَغْفِرْ اور تَرْحَمْ مجزوم ہیں اور اَكُنْ جوابِ شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

ترجمہ:

وَقِیْلَ :اور کہا گیا	یٰۤاَرْضُ :اے زمین
ابْلَعِیْ :تو نگل جا	مَآءَكِ :اپنا پانی
وَیٰسَمَآءُ :اور اے آسمان	اَقْلِعِیْ :تو تھم جا
وَغِیْضَ :اور کم (یعنی خشک) کیا گیا	الْمَآءُ :پانی کو
وَقُضِیَ :اور پورا کیا گیا	الْاَمْرُ :حکم کو
وَاسْتَوَتْ :اور وہ (یعنی کشتی) متمکن ہوئی	عَلَى الْجُوْدِیِّ :جودی (پہاڑ) پر

وَقِيْلَ : اور کہا گیا
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والی قوم کے لیے
نُوْحٌ : نوحؑ نے
فَقَالَ رَبِّ : تو کہا: اے میرے ربّ
مِنْ اَهْلِيْ : میرے گھر والوں میں سے ہے
الْحَقُّ : حق ہے
اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ : سب سے بڑا حاکم ہے
اِنَّهٗ لَيْسَ : یقیناً وہ نہیں ہے
اِنَّهٗ عَمَلٌ : بے شک یہ (پکارنا) ایک ایسا عمل ہے جو
فَلَا تَسْئَلْنِ : پس تو سوال نہ کر مجھ سے
لَكَ بِهٖ : تیرے لیے جس کا
اِنِّيْٓ اَعِظُكَ : بے شک میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ : جاہلوں میں سے
اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ : بے شک میں تیری پناہ میں آتا ہوں
مَا لَيْسَ لِيْ : اس کا نہیں ہے میرے لیے
وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ : اور اگر تُو نے نہ بخشا مجھ کو
اَكُنْ : تو میں ہو جاؤں گا
قِيْلَ يٰنُوْحُ : کہا گیا: اے نوحؑ
بِسَلٰمٍ : سلامتی کے ساتھ
وَبَرَكٰتٍ : اور ایسی برکتوں کے ساتھ جو
وَعَلٰٓى اُمَمٍ : اور ان اُمتوں پر ہیں
مِّمَّنْ : ان میں سے جو
وَاُمَمٌ : اور کچھ امتیں ہیں
ثُمَّ يَمَسُّهُمْ : پھر چھوئے گا ان کو
عَذَابٌ اَلِيْمٌ : ایک دردناک عذاب
مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ : غیب کی خبروں میں سے
اِلَيْكَ : آپؐ کی طرف

بُعْدًا : دوری ہو
وَنَادٰى : اور پکارا
رَبَّهٗ : اپنے ربّ کو
اِنَّ ابْنِيْ : بے شک میرا بیٹا
وَاِنَّ وَعْدَكَ : اور بے شک تیرا وعدہ
وَاَنْتَ : اور تو
قَالَ يٰنُوْحُ : اس نے کہا: اے نوحؑ
مِنْ اَهْلِكَ : تیرے گھر والوں میں سے
غَيْرُ صَالِحٍ : صالح کے علاوہ ہے
مَا لَيْسَ : اس کا نہیں ہے
عِلْمٌ : کوئی علم
اَنْ تَكُوْنَ : کہ (کہیں) تو ہو جائے
قَالَ رَبِّ : انہوںؑ نے کہا: اے میرے ربّ
اَنْ اَسْئَلَكَ : (اس سے کہ) میں سوال کروں تجھ سے
بِهٖ عِلْمٌ : جس کا کوئی علم
وَتَرْحَمْنِيْٓ : اور رحم نہ کیا مجھ پر
مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ : خسارہ پانے والوں میں سے
اهْبِطْ : آپؑ اتریں
مِّنَّا : ہماری طرف سے
عَلَيْكَ : آپؑ پر ہیں

مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ: آپؐ نہیں جانتے تھے ان کو — اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ: آپؐ اور نہ آپؐ کی قوم
مِنْ قَبْلِ هٰذَا: اس سے پہلے سے — فَاصْبِرْ: پس آپؐ ثابت قدم رہیں
اِنَّ الْعَاقِبَةَ: یقیناً (بھلا) انجام — لِلْمُتَّقِيْنَ: متقی لوگوں کے لیے ہے

نوٹ: حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس کا انصاف کس قدر بے لاگ ہے۔ مشرکینِ مکّہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں، ہم پر خدا کا عذاب نہیں ہوگا، کیونکہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی ایسے ہی کچھ گمان ہیں۔ اور بہت سے غلط کار مسلمان بھی اس قسم کے جھوٹے بھروسوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں، ان کی سفارش ہم کو خدا کے انصاف سے بچالے گی۔ لیکن یہاں یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لختِ جگر کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہے اور تڑپ کر بیٹے کی معافی کے لیے درخواست کرتا ہے۔ لیکن یہ دعا کام نہ آئی اور باپ کی پیغمبری بھی ایک بدعمل بیٹے کو عذاب سے نہیں بچا سکی۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۵۰ تا ۶۰

﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ
مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۵۲ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا
بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۳ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا
اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۵۴
مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا
مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ
اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ
شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۸ وَتِلْكَ عَادٌ ۫ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ
وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۵۹ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰﴾

ن ص و

نَصَا يَنْصُوْ (ن) نَصْوًا: کسی کو پیشانی سے پکڑنا۔
نَاصِيَةٌ (ج) نَوَاصٍ: پیشانی یا پیشانی کے بال۔ زیر مطالعہ آیت ۵۶۔ اور ﴿فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ

وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ (الرحمٰن) ''پھر انہیں پکڑا جائے گا پیشانیوں سے اور قدموں سے۔''

ع ن د

عَنَدَ یَعْنُدُ (ک) عُنُوْدًا: دشمنی کرنا۔ مخالفت کرنا۔

عَنِیْدٌ (فعیل کے وزن پر صفت): دشمنی کرنے والا یعنی دشمن، مخالف، زیر مطالعہ آیت ۵۹

ترکیب

(آیت ۵۰) گزشتہ آیت نمبر ۲۵ کے لَقَدْ اَرْسَلْنَا پر عطف ہونے اور اس کا مفعول ہونے کی وجہ سے اَخَا حالتِ نصب میں ہے اور اَخَا کا بدل ہونے کی وجہ سے ھُوْدًا بھی حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت ۵۲) اَلسَّمَآءَ مؤنث سماعی ہے اور اس کا حال مِدْرَارًا مذکر آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مِفْعَالٌ کا وزن مذکر مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔ (آیت ۵۵) کِیْدُوْا فعل امر کے جمع کا صیغہ ہے۔

ترجمہ:

وَاِلٰی عَادٍ: اور (بے شک ہم بھیج چکے ہیں) عاد کی طرف	اَخَاھُمْ: ان کے بھائی
ھُوْدًا: ہودؑ کو	قَالَ یٰقَوْمِ: انہوں نے کہا: اے میری قوم
اعْبُدُوا اللّٰہَ: تم بندگی کرو اللہ کی	مَا لَکُمْ: تمہارے لیے نہیں ہے
مِّنْ اِلٰہٍ: کوئی بھی الٰہ	غَیْرُہٗ: اس کے علاوہ
اِنْ اَنْتُمْ: نہیں ہو تم	اِلَّا مُفْتَرُوْنَ: مگر گھڑنے والے
یٰقَوْمِ: اے میری قوم	لَآ اَسْئَلُکُمْ: میں نہیں مانگتا تم سے
عَلَیْہِ اَجْرًا: اس پر کوئی معاوضہ	اِنْ اَجْرِیَ: نہیں ہے میرا اجر
اِلَّا عَلَی الَّذِیْ: مگر اس پر جس نے	فَطَرَنِیْ: پیدا کیا مجھ کو
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: تو کیا تم عقل نہیں رکھتے	وَیٰقَوْمِ: اور اے میری قوم
اسْتَغْفِرُوْا: تم مغفرت مانگو	رَبَّکُمْ: اپنے ربّ سے
ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ: پھر تم پلٹو اس کی طرف	یُرْسِلِ: تو وہ بھیجے گا
السَّمَآءَ: آسمان کو	عَلَیْکُمْ: تم پر
مِّدْرَارًا: موسلا دھار ہوتے ہوئے	وَّیَزِدْکُمْ: اور وہ زیادہ کرے گا تم کو
قُوَّۃً: بلحاظ قوت کے	اِلٰی قُوَّتِکُمْ: تمہاری (موجودہ) قوت کی طرف (یعنی پر)
وَلَا تَتَوَلَّوْا: اور روگردانی مت کرو	مُجْرِمِیْنَ: جرم کرنے والے ہوتے ہوئے

قَالُوْا یٰهُوْدُ: لوگوں نے کہا: اے ہودؑ
بِبَیِّنَةٍ: کسی واضح (دلیل) کے ساتھ
بِتَارِكِیْٓ اٰلِهَتِنَا: اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے
وَمَا نَحْنُ: اور ہم نہیں ہیں
اِنْ نَّقُوْلُ: ہم نہیں کہتے
بَعْضُ اٰلِهَتِنَا: ہمارے خداؤں میں سے کوئی
قَالَ اِنِّیْٓ: انہوں نے کہا: بے شک میں
وَاشْهَدُوْٓا: اور تم لوگ گواہ رہو
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ: اس سے جو تم لوگ شریک کرتے ہو
فَكِیْدُوْنِیْ: پس تم لوگ چالبازی کرو مجھ سے
ثُمَّ: پھر
اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ: بے شک میں نے بھروسہ کیا
رَبِّیْ: جو میرا رب ہے
مَا مِنْ دَآبَّةٍ: نہیں ہے کوئی بھی چلنے والا
اٰخِذٌ: پکڑنے والا ہے
اِنَّ رَبِّیْ: بے شک میرا رب
فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر تم لوگ منہ موڑو گے
مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ: وہ میں بھیجا گیا جس کے ساتھ
وَیَسْتَخْلِفُ: اور جانشین کرے گا
قَوْمًا: ایک قوم کو
وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ: اور تم لوگ نقصان نہیں پہنچاؤ گے اس کو
اِنَّ رَبِّیْ: بے شک میرا رب
حَفِیْظٌ: نگہبان ہے
اَمْرُنَا: ہمارا حکم
وَالَّذِیْنَ: اور ان کو جو
بِرَحْمَةٍ: ایک رحمت سے

مَا جِئْتَنَا: آپؑ نہیں آئے ہمارے پاس
وَمَا نَحْنُ: اور ہم نہیں ہیں
عَنْ قَوْلِكَ: آپؑ کی بات سے
لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ: آپؑ کی بات ماننے والے
اِلَّا اعْتَرٰىكَ: مگر (یہ کہ) لاحق ہو آپؑ کو
بِسُوْٓءٍ: بری طرح سے
اُشْهِدُ اللّٰهَ: گواہ بناتا ہوں اللہ کو
اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ: کہ میں بری ہوں
مِّنْ دُوْنِهٖ: اس کے علاوہ سے
جَمِیْعًا: سب کے سب
لَا تُنْظِرُوْنِ: تم لوگ مہلت مت دو مجھ کو
عَلَی اللّٰهِ: اللہ پر
وَرَبِّكُمْ: اور تمہارا ربّ ہے
اِلَّا هُوَ: مگر (یہ کہ) وہ
بِنَاصِیَتِهَا: اس کی پیشانی کو
عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: ایک سیدھی راہ پر ہے
فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ: تو تحقیق میں پہنچا چکا ہوں تم کو
اِلَیْكُمْ: تمہاری طرف
رَبِّیْ: میرا ربّ
غَیْرَكُمْ: تمہارے علاوہ
شَیْئًا: کچھ بھی

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ: ہر چیز پر
وَلَمَّا جَآءَ: اور جب آیا
نَجَّیْنَا هُوْدًا: ہم نے نجات دی ہودؑ کو
اٰمَنُوْا مَعَهٗ: ایمان لائے انؑ کے ساتھ
مِنَّا: ہماری طرف سے

وَنَجَّيْنٰهُمْ : اور ہم نے نجات دی ان کو
وَتِلْكَ عَادٌ : اور یہ عاد ہیں
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ : اپنے ربّ کی نشانیوں کا
وَاتَّبَعُوْٓا : اور پیروی کی

وَاُتْبِعُوْا : اور ان کے پیچھے لگا دیا گیا
لَعْنَةً : ایک لعنت کو
اَلَآ اِنَّ عَادًا : سن لو! بے شک عاد نے
رَبَّهُمْ : اپنے ربّ کی
قَوْمِ هُوْدٍ : ہود کی قوم کے لیے

مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ : ایک سخت عذاب سے
جَحَدُوْا : جنہوں نے جانتے بوجھتے انکار کیا
وَعَصَوْا رُسُلَهٗ : اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی
اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ : ہر ایک زبردستی کرنے والے مخالف کے حکم کی

فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا : اس دنیا میں
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ : اور قیامت کے دن (بھی)
كَفَرُوْا : ناشکری کی
اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ : سن لو! دوری ہے عاد کے لیے

آیات ۶۱ تا ۶۸

﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝۶۱ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۶۲ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝۶۳ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝۶۴ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝۶۵ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝۶۶ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۶۷ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝۶۸﴾

ص ی ح

صَاحَ يَصِيْحُ (ض) صَيْحًا : زور کی چیخ مارنا، چنگھاڑنا۔
صَيْحَةٌ : زوردار چیخ، چنگھاڑ۔ زیر مطالعہ آیت ۶۷۔

ترجمہ:

وَاِلٰی ثَمُوْدَ : اور (بے شک ہم بھیج چکے ہیں) ثمود کی طرف

اَخَاھُمْ : ان کے بھائی

صٰلِحًا : صالحؑ کو

قَالَ یٰقَوْمِ : انہوں نے کہا: اے میری قوم

اعْبُدُوا اللّٰہَ : تم بندگی کرو اللہ کی

مَالَکُمْ : تمہارے لیے نہیں ہے

مِّنْ اِلٰہٍ : کوئی بھی الٰہ

غَیْرُہٗ : اس کے علاوہ

ھُوَ اَنْشَاَکُمْ : اس نے اٹھایا تم کو

مِّنَ الْاَرْضِ : زمین میں سے

وَاسْتَعْمَرَکُمْ : اور بسایا تم کو

فِیْھَا : اس میں

فَاسْتَغْفِرُوْہُ : پس تم مغفرت مانگو اس سے

ثُمَّ تُوْبُوْٓا : پھر تم پلٹو

اِلَیْہِ : اس کی طرف

اِنَّ رَبِّیْ : بے شک میرا ربّ

قَرِیْبٌ : قریب ہے

مُّجِیْبٌ : قبول کرنے والا ہے

قَالُوْا یٰصٰلِحُ : ان لوگوں نے کہا: اے صالحؑ

قَدْ کُنْتَ فِیْنَا : تو رہا ہے ہم میں

مَرْجُوًّا : امیدیں وابستہ کیا ہوا

قَبْلَ ھٰذَآ : اس سے پہلے

اَتَنْھٰنَآ : کیا تو منع کرتا ہے ہم کو (اس سے)

اَنْ نَّعْبُدَ : کہ ہم بندگی کریں

مَا یَعْبُدُ : اس کی جس کی بندگی کرتے رہے

اٰبَآؤُنَا : ہمارے آباء واَجداد

وَاِنَّنَا : اور بے شک ہم

لَفِیْ شَکٍّ : یقیناً ایک شک میں ہیں

مِّمَّا : اس سے

تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ : تو بلاتا ہے ہم کو جس کی طرف

مُرِیْبٍ : جو اُلجھا دینے والا ہے

قَالَ یٰقَوْمِ : انہوںؑ نے کہا: اے میری قوم

اَرَءَیْتُمْ : کیا تم نے غور کیا (کہ)

اِنْ کُنْتُ : اگر میں ہوں

عَلٰی بَیِّنَۃٍ : ایک واضح (دلیل) پر

مِّنْ رَّبِّیْ : اپنے ربّ (کی طرف) سے

وَاٰتٰنِیْ : اور اس نے دی ہو مجھ کو

مِنْہُ رَحْمَۃً : اپنے (پاس) سے ایک رحمت

فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ : تو کون مدد کرے گا میری

مِنَ اللّٰہِ : اللہ سے (بچنے میں)

اِنْ عَصَیْتُہٗ : اگر میں نافرمانی کروں اس کی

فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ : پس تم لوگ نہیں بڑھاتے ہو مجھ کو

غَیْرَ تَخْسِیْرٍ : (مگر) خسارہ دینے کے علاوہ

وَیٰقَوْمِ : اور اے میری قوم

ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ : یہ اللہ کی اونٹنی ہے

لَکُمْ اٰیَۃً : تمہارے لیے ایک نشانی ہوتے ہوئے

فَذَرُوْھَا : تو تم چھوڑو اس کو

تَاْکُلْ : (کہ) وہ کھائے

فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ : اللہ کی زمین میں

وَلَا تَمَسُّوْھَا : اور تم مت چھونا اس کو

بِسُوْٓءٍ: کسی بُرائی سے
عَذَابٌ قَرِیْبٌ: ایک قریبی عذاب
فَقَالَ: تو (صالحؑ نے) کہا
فِیْ دَارِکُمْ: اپنے اپنے گھر میں
ذٰلِكَ وَعْدٌ: یہ ایک ایسا وعدہ ہے جو
فَلَمَّا جَآءَ: پھر جب آیا
نَجَّیْنَا: تو ہم نے نجات دی
وَالَّذِیْنَ: اور ان کو جو
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: رحمت سے اپنی (طرف) سے
اِنَّ رَبَّكَ: بے شک آپؐ کا رب
الْعَزِیْزُ: بالادست ہے
ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ: ظلم کیا چنگھاڑ نے
فِیْ دِیَارِهِمْ: اپنے گھروں میں
كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا: جیسے کہ وہ رہتے ہی نہ تھے
اَلَآ اِنَّ: سن لو! بے شک
كَفَرُوْا: ناشکری کی
اَلَا بُعْدًا: سن لو! دُوری ہے

فَیَاْخُذَكُمْ: ورنہ پکڑے گا تم کو
فَعَقَرُوْهَا: پھر (بھی) ان لوگوں نے ٹانگیں کاٹیں اس کی
تَمَتَّعُوْا: تم فائدہ اٹھالو
ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ: تین دن
غَیْرُ مَكْذُوْبٍ: جھوٹ کہے ہوئے کے علاوہ ہے
اَمْرُنَا: ہمارا حکم
صٰلِحًا: صالحؑ کو
اٰمَنُوْا مَعَهٗ: ایمان لائے انؑ کے ساتھ
وَمِنْ خِزْیِ یَوْمِئِذٍ: اور اس دن کی رسوائی سے
هُوَ الْقَوِیُّ: ہی قوت والا ہے
وَاَخَذَ الَّذِیْنَ: اور پکڑا ان کو جنہوں نے
فَاَصْبَحُوْا: پھر وہ ہو گئے
جٰثِمِیْنَ: اوندھے منہ گرنے والے ہوتے ہوئے
فِیْهَا: اس میں
ثَمُوْدَا: ثمود نے
رَبَّهُمْ: اپنے رب کی
لِّثَمُوْدَ: ثمود کے لیے

آیات ۶۹ تا ۷۶

﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾﴾

ح ن ذ

حَنَذَ یَحْنِذُ (ض) حَنْذًا: گوشت بھوننا۔

حَنِیْذٌ (فعیلٌ کے وزن پر صفت مفعولی): بھنا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت ۶۹

و ج س

وَجَسَ یَجِسُ (ض) وَجْسًا: پوشیدہ ہونا

اَوْجَسَ (افعال) اِیْجَاسًا: دل کا کسی چیز کو محسوس کرنا' جیسے گھبراہٹ' خوف وغیرہ۔ زیر مطالعہ آیت ۷۰

ض ح ک

ضَحِكَ یَضْحَكُ (س) ضَحْكًا: (۱) خوشی سے ہنسنا (۲) تعجب سے ہنسنا (۳) حقارت سے ہنسنا یعنی مذاق اڑانا۔ (۱) ﴿فَلْیَضْحَكُوْا قَلِیْلًا﴾ (التوبۃ: ۸۲) ''پس انہیں چاہیے کہ وہ ہنسیں کم''۔ (۲) ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝۵۹ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝۶۰﴾ (النجم) ''تو کیا اس بات سے تم لوگ تعجب کرتے ہو۔ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟'' (۳) ﴿وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ۝۱۱۰﴾ (المؤمنون) ''اور تم لوگ ان سے ٹھٹھا کرتے تھے۔''

ضَاحِكٌ (اسم الفاعل): ہنسنے والا۔ ﴿فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا﴾ (النمل: ۱۹) ''تو انہوںؑ نے تبسم فرمایا ہنسنے والا ہوتے ہوئے ان کی بات سے۔''

اَضْحَكَ (افعال) اِضْحَاكًا: ہنسانا۔ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝۴۳﴾ (النجم) ''اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور رُلاتا ہے۔''

ش ی خ

شَاخَ یَشِیْخُ (ض) شَیْخًا: (۱) بوڑھا ہونا (۲) علم' فضیلت یا رتبہ میں بڑا ہونا (اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

شَیْخٌ: (اسم صفت بھی ہے): (۱) بوڑھا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۲۔ (۲) عالم' استاد' سردار۔

ر و ع

رَاعَ یَرُوْعُ (ن) رَوْعًا: ڈرا دینا' گھبرا دینا۔

رَوْعٌ: ڈر' گھبراہٹ' زیر مطالعہ آیت ۷۴

ن و ب

نَابَ یَنُوْبُ (ن) نَوْبًا: (۱) واپس ہونا' لوٹنا۔ اس کے لیے عموماً اِلٰی کا صلہ آتا ہے۔ (۲) قائم مقام ہونا' نائب ہونا۔ اس کے لیے عموماً عَنْ کا صلہ آتا ہے۔

اَنَابَ (افعال) اِنَابَةً: (۱) کسی طرف رخ کرنا' متوجہ ہونا۔ اس کے لیے عموماً اِلٰی کا صلہ آتا ہے۔ (۲) کسی

کو قائم مقام مقرر کرنا' نائب بنانا۔ اس کے لیے عموماً عَنْ کا صلہ آتا ہے (اس معنی میں قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا)۔ ﴿وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ (لقمٰن:۱۵) ''اور تم پیروی کرو اس کے راستے کی جس نے رُخ کیا میری طرف۔''

مُنِيْبٌ (اسم الفاعل): رُخ کرنے والا' متوجہ ہونے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۵

ترکیب

(آیت ۶۹) قَالُوْا کا مفعول ہونے کی وجہ سے سَلٰمًا حالتِ نصب میں ہے۔ جبکہ قَالَ کا مقولہ Direct Tense میں ہونے کی وجہ سے سَلٰمٌ حالتِ رفع میں آیا ہے۔ (آیت ۷۰) رَاٰ کا مفعول ہونے کی وجہ سے اَيْدِيَهُمْ حالتِ نصب میں آیا ہے۔ جبکہ لَا تَصِلُ کا فاعل اس میں شامل هِيَ کی ضمیر ہے جو اَيْدِيَهُمْ کے لیے ہے۔ (آیت ۷۵) اِنَّ کا اسم اِبْرٰهِيْمَ ہے' جبکہ حَلِيْمٌ' اَوَّاهٌ اور مُنِيْبٌ یہ تینوں ان کی خبریں ہیں۔ (آیت ۷۶) اِنَّهٗ ضمیر الشان ہے۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ جَآءَتْ: اور بے شک آ چکے ہیں	رُسُلُنَآ: ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)
اِبْرٰهِيْمَ: ابراہیمؑ کے پاس	بِالْبُشْرٰى: خوشخبری کے ساتھ
قَالُوْا سَلٰمًا: ان لوگوں نے کہا: سلام	قَالَ سَلٰمٌ: انہوںؑ نے کہا: سلام
فَمَا لَبِثَ: پھر وہؑ نہیں رکے	اَنْ جَآءَ: تاکہ وہ آئیں
بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ: ایک بھنے ہوئے بچھڑے کے ساتھ	فَلَمَّا رَآٰ: پھر جب انہوںؑ نے دیکھا
اَيْدِيَهُمْ: ان کے ہاتھوں کو	لَا تَصِلُ اِلَيْهِ: (کہ) وہ نہیں پہنچے اس (بچھڑے) تک
نَكِرَهُمْ: تو انہوںؑ نے اجنبی جانا ان لوگوں کو	وَاَوْجَسَ: اور دل میں محسوس کیا
مِنْهُمْ خِيْفَةً: ان سے ایک خوف	قَالُوْا لَا تَخَفْ: انہوں نے کہا: آپؑ مت ڈریں
اِنَّآ اُرْسِلْنَآ: بے شک ہم بھیجے گئے ہیں	اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ: لوطؑ کی قوم کی طرف
وَامْرَاَتُهٗ: اور انؑ کی عورت (یعنی بیوی)	قَآئِمَةٌ: کھڑی تھیں
فَضَحِكَتْ: پھر وہ ہنسیں	فَبَشَّرْنٰهَا: تو ہم نے خوشخبری دی ان کو
بِاِسْحٰقَ: اسحاقؑ کی	وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ: اور اسحاقؑ کے پیچھے سے
يَعْقُوْبَ: یعقوبؑ کی	قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى: وہ کہنے لگی: ہائے ہائے میں؟
ءَاَلِدُ: کیا میں جنوں گی	وَاَنَا عَجُوْزٌ: اس حال میں کہ میں بہت بوڑھی ہوں
وَّهٰذَا بَعْلِيْ: اور یہ میرے شوہر ہیں	شَيْخًا: بوڑھے

اِنَّ هٰذَا : یقیناً یہ	لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ : تو بے شک ایک عجیب چیز ہے
قَالُوْٓا : ان لوگوں نے کہا	اَتَعْجَبِیْنَ : کیا آپ تعجب کرتی ہیں
مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ : اللہ کے حکم سے	رَحْمَتُ اللّٰهِ : اللہ کی رحمت
وَبَرَكٰتُهٗ : اور اس کی برکتیں ہیں	عَلَیْكُمْ : آپ لوگوں پر
اَهْلَ الْبَیْتِ : اے گھر والو!	اِنَّهٗ : بے شک وہ
حَمِیْدٌ : حمید کیا ہوا ہے	مَّجِیْدٌ : بڑی شان والا ہے
فَلَمَّا ذَهَبَ : پھر جب گئی	عَنْ اِبْرٰهِیْمَ : ابراہیمؑ سے
الرَّوْعُ : گھبراہٹ	وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی : اور آئی ان کے پاس خوشخبری
یُجَادِلُنَا : تو وہ بحث کرنے لگے ہم سے	فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ : لوطؑ کی قوم (کے بارے) میں
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ : بے شک ابراہیمؑ	لَحَلِیْمٌ : بُردبار تھے
اَوَّاهٌ : بہت دردمند تھے	مُّنِیْبٌ : متوجہ رہنے والے تھے
یٰٓاِبْرٰهِیْمُ : اے ابراہیمؑ	اَعْرِضْ : آپؑ اعراض کریں
عَنْ هٰذَا : اس سے	اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ : حقیقت یہ ہے کہ آچکا ہے
اَمْرُ رَبِّكَ : آپؑ کے رب کا حکم	وَاِنَّهُمْ : اور وہ لوگ
اٰتِیْهِمْ : آنے والا ہے ان کے پاس	عَذَابٌ : ایک ایسا عذاب جو
غَیْرُ مَرْدُوْدٍ : لوٹائے جانے والے کے علاوہ ہے	

نوٹ: آیت ۶۹ سے معلوم ہوا کہ آنے والوں کی مہمانی کرنا آدابِ اسلام اور مکارمِ اخلاق میں سے ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مہمانی کرنا واجب ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس پر ہیں کہ واجب نہیں ہے، بلکہ سنّت اور مستحسن ہے۔ بعض نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر واجب ہے کہ جو شخص ان کے گاؤں میں ٹھہرے اس کی مہمانی کریں، کیونکہ وہاں کھانے کا کوئی دوسرا انتظام نہیں ہوسکتا۔ اور شہر میں ہوٹل وغیرہ سے اس کا انتظام ہوسکتا ہے، اس لیے شہر والوں پر واجب نہیں ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۷۷ تا ۸۳

﴿وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ۝۷۷ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ۝۷۸ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ؕ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا

نُرِيْدُ ﴿٧٩﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿٨٠﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿٨١﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾

ذرع

ذَرَعَ يَذْرَعُ (ف) ذَرْعًا: (۱) کسی چیز کو ذراع (ایک پیمانہ کا نام) سے ناپنا۔ (۲) پیچھے سے آ کر بازو سے کسی کا گلا گھونٹنا' کمزور کرنا۔

ذَرْعٌ (اسم ذات): (۱) پیمائش' لمبائی (۲) کمزوری۔ زیر مطالعہ آیت ۷۷

ذِرَاعٌ: (۱) ایک پیمانہ (کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے سرے تک کا فاصلہ)۔ (۲) بازو' ہاتھ۔

(۱) ﴿فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا﴾ (الحاقۃ:۳۲) ''ایک ایسی زنجیر جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے''۔

(۲) ﴿وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ﴾ (الکہف:۱۸) ''اور ان کا کتا پھیلانے والا ہے اپنے دونوں بازوؤں کو''

ع ص ب

عَصَبَ يَعْصِبُ (ن) عَصْبًا: رسی کو بٹ کر مضبوط کرنا' سخت کرنا۔

عُصْبَةٌ: ایسی جماعت جس کے افراد باہم گتھے ہوئے ہوں' یعنی ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہوں۔ مضبوط جماعت' طاقتور جماعت۔ ﴿وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ﴾ (یوسف:۸) ''حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں''۔

عَصِيْبٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): سخت۔ زیر مطالعہ آیت ۷۷

هرع

هَرَعَ يَهْرَعُ (ف) هَرْعًا: اضطراب اور عجلت سے کسی طرف بھاگنا' بے سدھ ہو کر دوڑنا۔

اَهْرَعَ (افعال) اِهْرَاعًا: کسی کو مضطرب کر کے کسی طرف بھگانا' بے تحاشا دوڑانا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۸۔

ض ی ف

ضَافَ يَضِيْفُ (ض) ضَيْفًا: (۱) کسی طرف مائل ہونا' جھکنا۔ (۲) کسی کا مہمان ہونا۔

ضَيْفٌ (اسم ذات بھی ہے): مہمان۔ (یہ مذکر' مؤنث' واحد' جمع سب کے لیے آتا ہے اور اس کی جمع ضُيُوْفٌ بھی آتی ہے)۔ زیر مطالعہ آیت ۷۸۔

ضَيَّفَ (تفعیل) تَضْيِيْفًا: کسی کو مہمان بنانا' ضیافت کرنا۔ ﴿فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا﴾ (الکہف:۷۷) ''تو ان لوگوں نے انکار کیا کہ وہ مہمان بنائیں ان دونوں کو''

س ر ی

سَرٰی یَسْرِیْ (ض) سَرْیَۃً : رات میں چلنا۔ پھر مجرد چلنے کے لیے بھی آتا ہے۔ ﴿وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ ۝۴﴾ (الفجر) ''قسم ہے رات کی جب وہ چلتی ہے۔''

سَرِیٌّ (فعیل کے وزن پر صفت) : ہمیشہ اور ہر حال میں چلنے والا۔ پھر نہر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ۝۲۴﴾ (مریم) ''بنا دیا ہے آپ کے ربّ نے آپ کے نیچے ایک نہر۔''

اَسْرٰی (افعال) اِسْرَاءً : یہ ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہے۔ بَا کے صلہ سے متعدی ہوتا ہے۔ کسی کو لے کر نکلنا' کسی کو لے جانا۔ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا﴾ (الاسراء:۱) ''پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت۔''

اَسْرِ (فعل امر) : تُو لے کر نکل' تُو لے جا۔ زیر مطالعہ آیت ۸۱۔

ر ک ن

رَکُنَ یَرْکُنُ (ک) رَکَانَۃً : باوقار ہونا' قابلِ اعتماد ہونا۔

رَکِنَ یَرْکَنُ (س) رُکُوْنًا : کسی طرف مائل ہونا۔ ﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (ھود:۱۱۳) ''اور تم لوگ مت مائل ہو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا۔''

رُکْنٌ : ہر وہ چیز جس پر بھروسہ یا تکیہ کر کے تقویت حاصل کی جائے۔ سہارا۔ یہ واحد کے علاوہ اسم جمع کے طور پر بھی آتا ہے' جیسے رُکْنُ الرَّجُلِ : آدمی کے سہارے یعنی قوم۔ اور اس کی جمع اَرْکَانٌ بھی آتی ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۸۰۔ اور ﴿فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ﴾ (الذاریات:۳۹) ''پھر اس نے منہ موڑا اپنے بھروسوں کے ساتھ یعنی لشکر کے ساتھ''

س ج ل

سَجَلَ یَسْجُلُ (ن) سَجْلًا : (۱) اوپر سے پانی گرانا۔ (۲) کتاب کو لگاتار پڑھنا۔

سِجِلٌّ : دعووں اور فیصلوں کو لکھنے کے اوراق جو قاضی اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ جوڈیشل ریکارڈ۔ ﴿یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ﴾ (الانبیاء:۱۰۴) ''جس دن ہم لپیٹیں گے آسمان کو جیسے عدالتی کارروائی کی دستاویز کا لپیٹنا لکھی ہوئی ہونے کے لیے۔''

سِجِّیْلٌ : گیلی مٹی کی گولیاں بنا کر آگ میں پکا کر سخت کر لیتے ہیں۔ مٹی کے پتھر' کنکر۔ زیر مطالعہ آیت ۸۲۔

ن ض د

نَضَدَ یَنْضِدُ (ض) نَضْدًا : سامان کو ایک دوسرے پر چننا' تہہ در تہہ رکھنا۔

مَنْضُوْدٌ (اسم المفعول) : تہہ در تہہ کیا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت ۸۲۔

نَضِیْدٌ (فعیل کے وزن پر صفت) : تہہ بہ تہہ۔ ﴿لَهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ۝۱۰﴾ (قٓ) ''اس کے لیے خوشہ ہے تہہ بہ تہہ۔''

ترجمہ:

وَلَمَّا جَآءَتْ: اور جب آئے	رُسُلُنَا: ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)
لُوْطًا: لوطؑ کے پاس	سِیْٓءَ بِهِمْ: تو انؑ کو برا لگا ان (کے آنے) سے
وَضَاقَ بِهِمْ: اور وہؑ تنگ ہوئے ان (کے آنے) سے	ذَرْعًا: بلحاظ کمزوری کے
وَّقَالَ: اور انہوںؑ نے کہا	هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ: یہ ایک سخت دن ہے
وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ: اور آئی انؑ کے پاس ان کی قوم	يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ: بے تحاشا دوڑائی ہوئی ان کی طرف
وَمِنْ قَبْلُ: اور پہلے سے (ہی)	كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: وہ لوگ عمل کرتے تھے
السَّيِّاٰتِ: برائیوں کا	قَالَ يٰقَوْمِ: انہوںؑ نے کہا: اے میری قوم
هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ: یہ میری بیٹیاں ہیں	هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ: یہ زیادہ پاکیزہ ہیں تمہارے لیے
فَاتَّقُوا اللّٰهَ: تو تقویٰ کرو اللہ کا	وَلَا تُخْزُوْنِ: اور تم لوگ رسوا مت کرو مجھ کو
فِيْ ضَيْفِيْ: میرے مہمانوں (کے بارے) میں	اَلَيْسَ مِنْكُمْ: کیا نہیں ہے تم لوگوں میں
رَجُلٌ رَّشِيْدٌ: کوئی نیک چلن مرد	قَالُوْا: ان لوگوں نے کہا
لَقَدْ عَلِمْتَ: یقیناً آپؑ جان چکے ہیں	مَا لَنَا: ہمارے لیے نہیں ہے
فِيْ بَنٰتِكَ: آپؑ کی بیٹیوں میں	مِنْ حَقٍّ: کوئی بھی حق
وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ: اور بے شک آپؑ یقیناً جانتے ہیں	مَا نُرِيْدُ: اس کو جو ہم چاہتے ہیں
قَالَ: انہوںؑ نے کہا	لَوْ اَنَّ لِيْ: کاش کہ میرے لیے
بِكُمْ قُوَّةً: تم لوگوں پر کوئی طاقت ہوتی	اَوْ اٰوِيْٓ: یا میں پناہ لیتا
اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ: کسی مضبوط سہارے کی طرف	قَالُوْا يٰلُوْطُ: انہوں نے کہا: اے لوطؑ
اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ: بے شک ہم آپؑ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں	لَنْ يَّصِلُوْٓا: یہ لوگ ہرگز نہیں پہنچیں گے آپؑ تک
اِلَيْكَ: آپؑ تک	فَاَسْرِ: پس آپؑ لے کر نکلیں
بِاَهْلِكَ: اپنے گھر والوں کو	بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ: ایک حصے میں رات میں سے
وَلَا يَلْتَفِتْ: اور چاہیے کہ مڑ کر نہ دیکھے	مِنْكُمْ اَحَدٌ: تم میں سے کوئی ایک بھی
اِلَّا امْرَاَتَكَ: سوائے آپؑ کی عورت (یعنی بیوی) کے	اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا: حقیقت یہ ہے کہ آ لگنے والا ہے اس کو

مَآ اَصَابَهُمْ: وہ جو آ لگے گا ان کو
اِنَّ مَوْعِدَهُمُ: بے شک ان کے وعدے کا وقت
الصُّبْحُ: صبح کا ہے
اَلَيْسَ الصُّبْحُ: کیا صبح
بِقَرِيْبٍ: قریب نہیں ہے
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا: پھر جب آیا ہمارا حکم
جَعَلْنَا: تو ہم نے بنا دیا
عَالِيَهَا: اس (بستی) کے بلند کو
سَافِلَهَا: اس کا پست
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا: اور ہم نے برسائے اس پر
حِجَارَةً: کچھ پتھر
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ: تہہ بہ تہہ کیے ہوئے مٹی کے پتھر میں سے
مُّسَوَّمَةً: نشان لگے ہوئے
عِنْدَ رَبِّكَ: آپؐ کے رب کے پاس سے
وَمَا هِيَ: اور نہیں ہے یہ (بستی)
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: ان ظالموں سے (یعنی مکّہ والوں سے)
بِبَعِيْدٍ: کچھ دور

نوٹ ۱: آیت ۷۷ میں لفظ سِیْٓءَ آیا ہے جو کہ ماضی مجہول ہے۔ اور اگلی آیت میں پھر مضارع مجہول یُهْرَعُوْنَ آیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس بات نے لوط علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی اور ان کی قوم کو سرپٹ دوڑایا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اطلاع لوط علیہ السلام کے گھر کا کوئی فرد ہی پہنچا سکتا ہے‘ جبکہ ان کے گھر کے تمام افراد مؤمن تھے اور پوری بستی میں یہی ایک گھر مؤمن تھا۔ (الذاریات: ۳۵‘۳۶) زیر مطالعہ آیت ۸۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیوی مؤمنین میں شامل نہیں تھی‘ اس کی ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ تھیں اور وہ پہلے بھی اپنی قوم کو خبریں پہنچاتی رہتی تھی‘ جس کو قرآن مجید میں خیانت کہا گیا ہے۔ (التحریم: ۱۱) اس سے معلوم ہو گیا کہ مہمانوں کی آمد کی اطلاع لوطؑ کی بیوی نے پہنچائی تھی۔ حالانکہ وہ لوط علیہ السلام کے گھر کی ایک فرد تھی‘ لیکن اپنے عمل کی وجہ سے وہ عذاب کی مستحق قرار پائی۔

نوٹ ۲: آیت ۷۸ میں حضرت لوط علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ میری بیٹیاں ہیں‘ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کی رائے ہے اپنی لڑکیوں سے مراد پوری قوم کی لڑکیاں ہیں‘ کیونکہ ہر پیغمبر اپنی قوم کے لیے مثل باپ کے ہوتا ہے اور پوری اُمّت اس کی روحانی اولاد ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی خبیث عادت سے باز آؤ‘ شرافت کے ساتھ قوم کی لڑکیوں سے نکاح کرو اور اُن کو بیویاں بناؤ۔ (معارف القرآن) ❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

مباحثِ عقیدہ (۶،۵)

مؤمن محمود

اثباتِ صفات مع التنزیہہ

ہم امام بیہقی علیہ الرحمہ کی کتاب الاعتقاد والھدایۃ الی سبیل الرشاد کے تیسرے باب کا آغاز کر چکے ہیں جو ذکر اسماء اللہ وصفاتہ عزت اسماءہ وجل ثناءہٗ' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات کے بیان میں ہے۔ اس ضمن میں ہم نے اسماء وصفات کے حوالے سے کچھ اصول دیکھے۔ ان میں جو اصل الاصول ہم سب کو پیش نظر رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وصف وہی بیان کرتے ہیں جو اس نے خود بیان کیا' یعنی نحن نصف اللہ بما وصف نفسہ' لیکن تنزیہہ کے ساتھ۔ تنزیہہ کی قید لگا کر ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تمام اوصاف' صفات اور اسماء کا اثبات کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کے ضمن میں امام غزالیؒ نے خصوصی وضاحت فرمائی کہ اصلاً ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وہی صفات جان سکتے ہیں کہ جو ہماری اپنی ذات میں موجود ہیں۔ یعنی ہم اللہ کو علیم جانتے ہیں اس لیے کہ ہم اپنے اندر علم پاتے ہیں۔ ہم اس کو قدیر جانتے ہیں' مرید جانتے ہیں' سمیع جانتے ہیں' بصیر جانتے ہیں کیونکہ ان تمام صفات کا کچھ نہ کچھ پرتو' کچھ نہ کچھ عکس کسی نہ کسی درجے میں انسان کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وہی صفات جان سکتا ہے کہ جن کو وہ اپنی ذات میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اللہ بھی اسی طرح جانتا ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ شاید اللہ بھی اسی طرح سمیع ہے جیسا کہ ہم سمیع ہیں اور اللہ بھی اسی طرح بصیر ہے جیسا کہ ہم بصیر ہیں۔ اس شبہ سے نکلنے کے لیے تنزیہہ کی قید لگا دی گئی۔ یعنی تم نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پہچانا ہے اپنی صفات کے ذریعے اور انہی صفات کا اثبات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کیا لیکن اب یہ بات جان لو کہ اللہ کی صفات اور تمہاری صفات کی حقیقت ایک نہیں ہے۔ یہ مشارکۃ فی الاسم ہے۔ اسم میں تو تم مشارک ہو۔ تم بھی سمیع ہو وہ بھی سمیع ہے' تم بھی بصیر ہو وہ بھی بصیر ہے' تم بھی حلیم ہو وہ بھی حلیم ہے بلکہ تمہیں تو کہا گیا ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کو اختیار کرو۔ یہاں چونکہ تشبیہ کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا یعنی ہم سمجھتے کہ شاید اللہ بھی یوں ہی جانتا ہے تو بس اب لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کی قید کے ساتھ سمجھو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تمام صفات کا اثبات کرو اس کی تنزیہہ کا اقرار کر کے۔

یہیں سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ کی صفات اور اس کے اسماء بس وہی نہیں ہیں جو ہم نے جان لیے' ہم نے پہچان لیے یا جو قرآن مجید میں نازل ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے وہ حدیث دیکھی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے نبی مکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((اَوِاسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ)) (صحیح ابن حبّان)

’’جو (اسماوصفات) تو نے اپنے پاس غیب میں محفوظ کر لیے ہیں۔‘‘ تو گویا بہت سی صفات ایسی ہیں جن کا کوئی مثل ہم میں نہیں ہے۔ مثل تو بالکل نہیں ہے‘ اس کا کوئی پرتو بھی نہیں ہے۔ ان صفات کو ہم جان بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لَا یَعْرِفُ اللّٰہ اِلَّا اللّٰہ۔ پہلی بات ہم نے یہ دیکھی کہ ہم اللہ کا وصف بیان کریں گے‘ اللہ کی صفت بیان کریں گے جو اس نے اپنی ذات کے لیے بیان کی ہے اور ساتھ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ کی بریکٹ لگائیں گے۔ اس آیت کو ہی دیکھ لیں۔ ﴿لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ۚ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ⑪﴾ (الشوریٰ) تو گویا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اللہ کی صفات کا انکار کر دو بلکہ وہی تو سمیع وبصیر ہے۔ ہم اللہ کی سماعت وبصارت کا اثبات کریں گے اللہ سے مثلیت کی کلیتاً نفی کرتے ہوئے۔ یہ قاعدہ ہے صفات کے بارے میں جو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کچھ لوگ اس پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ اللہ کا وصف بیان کرو جو اس نے بیان کیا ہے‘ لیکن تنزیہہ پر اتنا زور نہیں ہے۔ اہلِ سُنّت کا مسلک تنزیہہ پر کھڑا ہے کہ ہم اللہ کے اوصاف بیان کریں گے تشبیہ وتمثیل کی نفی اور تنزیہہ کے اثبات کے ساتھ۔

لفظ جلالہ کا اسم ذات ہونا مسئلہ فروعی ہے

بہت سے علماء کے ہاں اسم ذات لفظ اللہ ہے‘ لفظ جلالہ ہے لیکن لفظ اللہ یا لفظ جلالہ کو اسم ذات ماننا کوئی عقیدے کا مسئلہ نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ نہیں بھی مانتے اور کہتے ہیں کہ میرے خیال میں اللہ بھی مشتقات میں سے ہے اور یہ اسم مرتجل نہیں ہے یعنی شروع میں وضع نہیں کیا گیا بلکہ مشتق ہے تو اس میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ عقیدے کے کوئی بنیادی مسائل میں سے نہیں بلکہ فروعی مسائل میں سے ہے۔ لہٰذا دونوں طرف آپ کو علماء کی آراء مل جائیں گی۔ کچھ کہیں گے نہیں یہ اسم ذات ہے‘ کچھ کہیں گے نہیں اللہ کا کوئی اسم ذات نہیں ہے یا اگر اللہ کا اسم ذات ہے تو وہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ سب کے سب صفاتی نام ہیں لیکن اکثر علماء اس کے قائل ہیں کہ اسم ذات اللہ ہے۔ واللہ اعلم!

صفاتِ جمال وجلال

صفات کے اعتبار سے کئی طرح کی تقسیم کی گئی ہے۔ ایک تقسیم ہے: صفاتِ ذاتیہ‘ صفاتِ سلبیہ‘ صفاتِ معانی‘ صفاتِ معنویہ‘ اور پھر پانچویں قسم جو اصلاً انہی کے تحت ہے وہ ہے صفات الافعال۔ ایک اور تقسیم بھی ہے جو کچھ متکلّمین اور صوفیاء کے ہاں ہے۔ وہ ہے: صفاتِ جلال اور صفاتِ جمال۔ یہ تقسیم اس اعتبار سے نہیں کی جاتی کہ عقیدے کا کوئی مسئلہ ہے کہ ان صفات کا علم ہو جائے کہ بلکہ اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ: تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو)۔ اس کا تخلق اختیار کرو۔ تخلق کا مطلب تکلفاً یعنی کوشش کر کر کے‘ باب تفعل سے ہے کوشش کر کے اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیا اللہ کی تمام صفات اپنے اندر پیدا کی جاسکتی ہیں؟ نہیں‘ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ تو صفاتِ جمال وہ ہیں جو بندوں کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جبکہ صفاتِ جلال صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لائق ہیں‘ اسی کو زیب دیتی ہیں۔ مثال

کے طور پر صفاتِ جلال میں المتکبر ہے‘ القہار ہے‘ الجبار ہے‘ العزیز ہے‘ یہ وہ صفات کہ جن کے اندر قوت‘ قہر‘ اللہ کے ارادے اور اختیار کا بیان ہے۔ یہ ساری صفات‘ صفاتِ جلال ہیں۔ ان صفات کا تخلق یہ ہے کہ ان کی ضد انسان اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی اللہ اگر الغنی ہے تو اس کے مقابلے میں ہمارے اندر جو صفت پیدا ہوگی وہ الفقر کی ہوگی۔ اللہ الغنی ہے اور ہم الفقیر ہیں۔ اللہ العلیم ہے تو ہم اس کے سامنے اپنے آپ کو بالکل جاہل ہی سمجھ رہے ہیں۔ ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ (البقرۃ:۳۲) اسی طرح اللہ العزیز ہے تو ہم الذلیل ہیں۔ اللہ المتکبر ہے تو ہمارے اندر تواضع کی صفت پیدا ہونی چاہیے۔ چنانچہ صفاتِ جلال میں اس خلق کو حاصل نہیں کرنا ہوتا بلکہ اس کے متضاد اخلاق پیدا کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس صفاتِ جمال میں انہی کا کوئی پرتو اپنے اندر پیدا کیا جائے۔ اللہ حلیم ہے تو ہمیں کہا گیا کہ تم بھی حلم اختیار کرو۔ اسی طرح اللہ کریم ہے تو ہمیں کرم کا حکم دیا گیا۔ اللہ جواد ہے تو ہمیں سخاوت کا حکم دیا گیا۔ اللہ غفور ہے تو ہمیں بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ عفو ہے تو ہمیں بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کرنی ہے۔ گویا صفاتِ جمال اور جلال کی تقسیم اس اعتبار سے ہے‘ کہ صفاتِ جمال وہ ہیں کہ جو بندہ کوشش کر کے‘ کسب کر کے اپنے اندر پیدا کرے اور صفاتِ جلال وہ ہیں کہ جس کے سامنے خشیت‘ خشوع اور تضرع کے ساتھ جھک جائے۔

صفت النفسیۃ (وجود) کو صفت تسامحاً کہتے ہیں

ہم نے صفات کی تقسیم میں صفت النفسیہ دیکھی تھی۔ یہ صفتِ وجود ہے۔ علماء نے اس کو صفت تسامحاً کہا ہے۔ تسامحاً کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ابھی یہ نہیں بتانا چاہ رہے کہ اللہ کی ذات پر ایک اضافی صفت‘ صفتِ وجود ہے بلکہ ہم صفتِ وجود کہہ کر یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ اللہ کی ذات متحقق ہے‘ ثابت ہے اور زیادہ تسامحاً کہیں تو خارج میں ثابت ہے۔ یعنی اللہ کی ذات موجود ہے۔ یہ بتانے کے لیے ہم کہتے ہیں اللہ کی صفتِ نفسیہ وجود ہے جو صفت ذاتیہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ وجود رکھتے ہیں اور ہم بھی وجود رکھتے ہیں تو علماء نے بیان کیا کہ ہم وجود مع اللہ نہیں بلکہ وجود باللہ رکھتے ہیں۔

ہم اللہ کے ساتھ کوئی متوازی‘ متساوی‘ ہمسر وجود نہیں ہیں بلکہ ہم اللہ کی وجہ سے ہیں۔ ہم اللہ کی قوت اور مدد سے ہیں‘ ہم اس کی توفیق سے ہیں۔ ہم اس کی امداد سے وجود میں آئے ہیں۔ ہم موجود ہیں لیکن باللہ ہیں‘ مع اللہ نہیں ہیں۔ حقیقی وجود‘ ذاتی وجود‘ کامل وجود‘ واجب الوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے۔ گویا اگر اس معانی میں کوئی یہ بھی کہہ دے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ‘ تو اس سے مراد یہ ہے کہ حقیقی وجود‘ ذاتی وجود‘ لفظ وجود کا حقیقی اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر نہیں ہوتا۔ باقیوں پر ہوتا بھی ہے تو مجازاً۔ اسی لیے بعض علماء کا یہ قول عرض کیا گیا تھا کہ لفظ وجود مشترک لفظی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لفظ وجود کے جو معانی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں متحقق ہو رہے ہیں وہ مخلوق میں متحقق نہیں‘ بس لفظی مشارکت ہے۔ اس کو مشترک لفظی کہتے ہیں۔ جب ہم اللہ کے لیے لفظ وجود اور اپنے لیے لفظ وجود بولتے ہیں تو جس طرح کسی اور صفت میں اللہ کی مانند کوئی نہیں ہے اسی طرح اس کے وجود میں بھی اس کے مانند کوئی نہیں ہے۔ حقیقی وجود اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے۔

مخلوقات فی نفسہٖ معدوم ہیں

اسی لیے ہم نے واجب الوجود اور ممکن الوجود کی تقسیم کا ذکر کیا تھا۔ اللہ واجب الوجود ہے کہ جس کا عدم ممتنع ہے‘ جس کا عدم ممکن نہیں ہے‘ جس کو وجود لائق اور سزاوار ہے۔ اللہ کے سوا جتنے بھی موجودات ہیں ان کی اصل عدم ہے۔ ان کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے واجب الوجود کی حاجت ہے۔ لہٰذا ہماری اصل عدم ہے۔ (اَلْاِنْسَانُ لَیْسَ لَہٗ مِنْ نَفْسِہٖ اِلَّا الْعَدم) انسان اپنے نفس میں جو ذاتی شے اپنے طرف سے رکھتا ہے وہ عدم ہے۔ یعنی اگر میرے سے پوچھا جائے کہ تمہارے پاس تمہارا ذاتی کیا ہے‘ تو عدم کے سوا میرا ذاتی کچھ نہیں ہے کیونکہ جو کچھ عطا ہوا ہے وہ کہیں اور سے ہے۔ اگر میں اپنی ذات میں کسی شے کا مالک ہوں تو وہ عدم ہے۔ چونکہ عدم کوئی شے نہیں ہے‘ لہٰذا میں کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ کئی دفعہ ہم کہہ دیتے ہیں کہ ممکن الوجود میں وجود اور عدم کا پلڑا برابر ہوتا ہے تو یہ بھی تساہاً کہتے ہیں۔ یعنی ممکن الوجود میں اصلاً عدم ہوتا ہے‘ وجود ہوتا ہی نہیں ہے‘ پلڑا برابر نہیں ہوتا۔ کوئی درمیانی حالت نہیں ہے کہ ادھر چلے جاؤ یا اُدھر چلے جاؤ۔ انسان عدم کا شکار ہو جائے گا اگر اللہ کی مدد اور اس کی قیومیت ایک لحظہ کے لیے بھی منقطع ہو جائے۔ لہٰذا آپ دیکھیں:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾﴾ (فاطر)

’’یقیناً اللہ ہی تھامے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو کہ وہ (اپنے راستے سے) ہٹ نہ جائیں۔ اور اگر وہ ہٹ جائیں تو کوئی نہیں جو ان کو تھام سکے اس کے بعد! یقیناً وہ بہت بردبار‘ بہت بخشنے والا ہے۔‘‘

اور اگر یہ ٹل جائیں‘ زوال کا شکار ہو جائیں‘ عدم کا شکار ہو جائیں تو اللہ کے سوا انہیں تھام بھی کون سکتا ہے! اللہ کی طرف سے مستقل ایک امداد ہے‘ اس کی طرف سے مستقل ایک فیضان ہے‘ جود و کرم ہے جس کی بنا پر یہ اشیاء وجود پا رہی ہیں۔ اگر یہ منقطع ہو جائے یا اللہ تعالیٰ اپنی امداد اور فیض ایک لحظے کے لیے روک لے تو یہ سب کچھ عدم کا شکار ہو جائے گا۔ ممکن الوجود‘ واجب الوجود کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ممکن الوجود ہیں‘ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہیں یعنی اپنے ہونے میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔

صفاتِ سلبیہ

صفاتِ سلبیہ صفاتِ معانی سے پہلے کیوں آئیں‘ اس کی توجیہہ میں علماء نے ایک نکتہ یہ بیان کیا کہ اللہ بھی ہمیشہ تسبیح کو حمد سے مقدم رکھتے ہیں۔ یعنی قرآن مجید میں آپ جہاں بھی دیکھتے ہیں کہ تسبیح اور حمد کا ذکر آیا:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْھِرُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (الروم)

’’تو تم تسبیح کرو اللہ کی جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو۔ اور اُسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں‘ اور رات کو اور جب تم ظہر کرتے ہو۔‘‘

وہاں تسبیح پہلے ہے اور حمد بعد میں ہے۔ اسی طرح اللہ کے نبی ﷺ سے جتنے کلمات مروی ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

تو ان میں بھی تسبیح مقدم ہے، حمد موخر ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سُنّت بھی یہی ہے کہ وہ اولاً کچھ چیزوں کی نفی اپنی ذات سے فرماتے ہیں، یعنی نفی مقدم ہے اثبات پر۔ اسی ترتیب کو پیشِ نظر رکھا ہے علماء نے کہ صفاتِ معانی میں تو کچھ معانی ہیں جن کا اثبات کیا جا رہا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات میں۔ جبکہ صفاتِ سلبیہ میں کچھ چیزوں کی نفی جا رہی ہے۔ صفاتِ سلبیہ گویا بمعنیٰ تنزیہ اور تسبیح کے ہیں اور صفاتِ معانی بمعنیٰ حمد کے ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ تسبیح ہر نقص کی نفی ہے، حمد ہر صفتِ کمال کا اثبات ہے۔

صفتِ قدم

صفاتِ سلبیہ میں سب سے مقدم صفتِ قدم ہے۔ لفظ قدم مصدر ہے اور اس سے جو اسم بنے گا وہ قدیم ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ لفظ قدیم کا اطلاق اللہ کے حق میں جائز نہیں۔ کیوں جائز نہیں ہے؟ اس لیے کہ مروی نہیں ہے۔ اسماء وصفات توقیفی ہوتے ہیں۔ عمومی قاعدہ یہی ہے۔ اسم کا اثبات نہیں ہوگا بغیر توقیف کے، لیکن یہاں تو اثبات کر لیا گیا۔ قدیم کا لفظ قرآن وحدیث میں وارد ہوتا نظر نہیں آیا۔ لہٰذا بہت سے علماء خصوصاً آج کل کے، سب سے پہلا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ قدیم کا لفظ وارد نہیں ہے۔ یہ بات چلی آ رہی ہے کہ قدیم کا لفظ کہیں وارد نہیں ہے، لیکن کچھ علماء نے کہا کہ قدیم کا لفظ تو وارد ہے۔ یہ لفظ مسند احمد اور سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے جو مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دعا پڑھی جاتی ہے:

((اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ))(ابوداؤد)

یہ روایت ثابت ہے۔ اب یہاں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ سلطانہ القدیم ہے، اس کی صفت کو قدیم کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس صفت کو قدیم کہا گیا ہے تو ذات تو بالاولیٰ قدیم ہوگی۔ یعنی اگر صفت اس کی قدیم ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ذات قدیم نہ ہو۔ صفت کو قدیم کہہ دیا تو ذات کے لفظ پر بھی قدیم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیسے مرتضیٰ زبیدی علیہ الرحمہ، جنہوں نے احیاء العلوم کی شرح کی، انہوں نے کہا کہ اسماء واقعی توقیفی ہوتے ہیں لیکن اگر قدیم کا لفظ وارد نہیں بھی ہوا تو اُمّت کا اجماع ہے: اجمعت الامة علی تسمیة الله سبحانه وتعالیٰ بالقدیم، لہٰذا جائز ہے۔ اس پر کچھ علماء نے ردّ کیا کہ نہیں اُمت کا اجماع نہیں ہوا اس لیے کہ شروع سے ابھی تک کچھ لوگ اس کا انکار کرتے چلے آئے ہیں۔ متقدمین میں مشہور ہیں ابن حزمؒ۔ انہوں نے فرمایا کہ لفظ قدیم کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ بعد میں آنے والوں میں بھی بہت سے لوگ ہیں، ابن تیمیہ علیہ الرحمہ بھی یہی بات کہتے ہیں کہ لفظ قدیم کا اطلاق درست نہیں ہے۔ بہرحال جب سلطانہ القدیم کا لفظ آ گیا تو قدیم کا اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے زیادہ سے زیادہ اگر مختلف فیہ مسئلہ ہوگا تو اس حوالے سے کہ لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ باقی یہ معانی اللہ

سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں ثابت ہیں۔

الاول کا مطلب صرف ''پہلا'' ہونا نہیں

قدیم کا مطلب ہے سلب البدایۃ۔یعنی اگر لفظ میں دیکھیں تو آغاز یا ابتدا کی نفی کی گئی ہے وہ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ابتدا کوئی نہیں ہے اور قرآن وحدیث میں اس کے لیے لفظ الاول آیا ہے:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳)

اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَکَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَکَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَکَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَکَ شَيْءٌ ' اقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَاَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ)) (صحیح مسلم)

یہ سارا کچھ فرمانے کے بعد اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: اے اللہ! ہمیں قرض سے نجات دے۔یعنی اللہ کی صفات بیان کر کے کچھ دعا بھی مانگی گئی ہے اور وہ دعا قرض سے چھٹکارے کی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ قرض کوئی اچھی شے نہیں ہے۔بہر حال لفظ قدیم کا قرآنی اطلاق اگر دیکھا جائے تو وہ الاول ہے۔قدیم کا مطلب سلب البدایہ ہے۔سلب بدایہ کا مطلب ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی ابتدا نہیں' لفظ اول اپنے اندر یہ ایہام رکھتا ہے کہ وہ الاول ہے' اسی لیے فلیس قبلک شیءٌ۔اس حدیث کی توضیح میں علماء نے کہا: انت الاول کا مطلب ہے: انت الاول بلا اولیہ۔آپ الاوّل ہیں جس کا کوئی اول نہیں ہے اور فلیس قبلک شیءٌ کا مطلب ہے: فلیس قبلک شیءٌ لانہ لا قبلیۃ قبلک یعنی آپ سے پہلے کا مطلب ہی کچھ نہیں ہے' آپ ہمیشہ سے ہیں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہم اول اس معانی میں نہیں کہہ رہے کہ وہ سب سے پہلے آئے' اس کے بعد باقی لوگ اللہ نے پیدا فرما دیے۔نہیں' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔وہ ہمیشہ سے ہیں اور بقایہ ہے کہ ہمیشہ رہیں گے۔تو انت الاول بلا اولیہ وانت الآخر بلا آخر یہ صفتِ قدم ہے۔

قدم حقیقی اور قدم بالزمان کا فرق

لفظ قدیم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے استعمال ہو یا نہ ہو' اس کے معانی کا اطلاق ضرور ہوگا۔علماء نے قدیم کی دو تقسیمیں کیں۔ایک قدیم بالزمان اور دوسری قدیم حقیقی۔قدیم بالزمان کا مطلب ہے: جب سے زمان ہے وہ ہے۔اس معانی میں علماء نے کہا کہ اگر کوئی عالم کو بھی قدیم کہہ دے تو ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے' یعنی ہماری لڑائی اصطلاحات میں نہیں ہوتی۔ہم جو قدیم سے معانی لے رہے ہیں وہ ہے: غیر مسبوق بالعدم۔بس اتنا ضرور مانو کہ اللہ کے سوا جو شے ہے وہ مسبوق بالعدم ہے۔اس سے پہلے عدم تھا۔یعنی تم عالم کو بے شک قدیم بالزماں کہہ دو لیکن یہ مانو کہ عالم مسبوق بالعدم ہے۔یعنی اس سے پہلے اس کا عدم تھا۔وہاں وقت نہیں تھا' عدم تھا بس۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ قدیم حقیقی ہیں' کیونکہ قدیم بالزماں تو زمان کے اندر ہوتا ہے اور قدیم حقیقی خارج از زمان ہے جس پر زمان وارد ہی نہیں

ہوتا۔یعنی یہ نہیں ہے کہ وہ زمانے میں سب سے پہلے ہیں بلکہ یہ کہ وہ ماقبل زمان ہیں۔ان پر زمانہ نہیں گزرتا۔اس کو علماء کہتے ہیں کہ وہ وجود متزمن یا وجود متمکّن نہیں ہے۔متمکّن اور معانی میں بھی ہے لیکن متزمن' الذی فی الزمان' والمتمکن الذی فی المکان۔ فلیس اللہ فی المکان ولیس فی الزمان بل ھو خارج۔خارج کا لفظ بھی تسامح کے ساتھ ہے۔خارج از زمان والمکان۔تو لفظ قدم سے ہم یہ مراد لے رہے ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی صفت سلبیہ جو سب سے پہلے ہے وہ قدیم ہے' قدیم حقیقی ہے۔اسی قدیم حقیقی کے لیے کچھ علماء قدیم بالذات کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔

عالم کو قدیم کہنا بھی ہے تو قدیم بالزمان کہہ دو لیکن اس لاحقے کے ساتھ کہ: قدیم بالزمان ولکنہ مسبوق بالعدم۔لیکن وہ عدم کے بعد ہے۔جس نے یہ بات مان لی' اس نے ٹھیک بات مان لی اور جس نے یہ کہہ دیا کہ عالم یا کوئی ایسی شے جو اس کا مادہ' ہیولہ یا substance ہے وہ ہمیشہ سے وجود رکھتا ہے تو اب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت قدم میں شرک ہو گیا۔یعنی اگر اللہ قدیم ہے' اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے اور اللہ کے سوا بھی کوئی شے ایسی ہو گئی کہ جس کی کوئی ابتدا نہیں ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں شرکت ہو گئی جو کہ شرک ہے۔یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر ہمارے علماء اہلِ سُنّت نے فلاسفہ میں سے بہت سے لوگوں کی تکفیر کر دی۔جیسے کہ امام غزالیؒ نے کچھ مسائل پر فلاسفہ فارابی اور کچھ دوسرے لوگوں کی تکفیر کی ہے۔ان میں سے ایک مسئلہ یہی ہے کہ وہ کسی substance کو' ہیولہ کو' کسی مادہ (matter) کو قدیم مانتے ہیں۔یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں الحاد ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۸۰﴾ (الاعراف)

''اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں' تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے۔اور چھوڑ دو اُن لوگوں کو جو اُس کے ناموں میں کجی نکالتے ہیں۔عنقریب وہ بدلہ پائیں گے اپنے اعمال کا۔''

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ سے الحاد کا ایک معنیٰ مروی ہے کہ اللہ کی کسی صفت کا مخلوق میں اثبات کر دینا۔وہ صفات' وہ اسماء جو خاص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہیں' اگر ان میں سے کسی صفت کا اثبات غیر اللہ کے لیے ہو گیا تو یہ الحاد فی الاسماء ہے۔صفت قدم کا مطلب ہے: غیر مسبوق بالعدم ہونا اور یہ صرف اللہ کی شان ہے۔جس نے اللہ کی اس شان میں کسی اور کو شریک کر دیا تو اس وجہ سے انسان مشرک اور کافر ہو جائے گا۔

ارواحِ انسانیہ قدیم نہیں ہیں

نہ ارواح انسانیہ نہ ملائکہ' نہ اللہ کی بنائی ہوئی کوئی اور مخلوق اس کے ساتھ قدیم ہے بلکہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ مسبوق بالعدم ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مخلوق ہے۔کئی دفعہ بہت سے لوگوں میں اس طرح کا شبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید ارواح انسانیہ بھی قدیم ہیں اور وہ اللہ کی ذات کا کوئی جز و تھیں' پھر برآمد ہو کر نعوذ باللہ خارج میں آ گئیں۔یہ تصور درست نہیں ہے' بلکہ انسان کو شرک تک پہنچا سکتا ہے۔یہ خطرناک بات ہے۔قرآن مجید میں جو جا بجا

رَاجِعُوْنَ کا لفظ آتا ہے اس سے لوگ غلط استدلال کرتے ہیں۔ جیسے کسی نے کہہ دیا کہ ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾ راجعون کا مطلب ہے کہ ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف ہی واپس جانا ہے' تو گویا ارواح انسانی وہیں سے نکلی ہیں اور وہیں جانا ہے۔ قرآن کی تفسیر اس طرح نہیں کی جاتی بلکہ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا۔ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ کی طرف رجوع کا ذکر آیا ہے' وہاں کسی ذات کی طرف رجوع کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد ہے ہم نے تمہیں بھیجا ہے تو حساب کتاب کے لیے ہم تمہیں اپنے سامنے حاضر کریں گے۔ انا من اللہ نہیں ہے' یعنی انا من اللہ وانا الیہ راجعون نہیں ہے بلکہ انا لِلّٰہِ ہے۔ من ابتدا کے بیان کے لیے ہے یعنی اگر یہ بیان کرنا ہو کہ میں آیا کہاں سے ہوں تو اس کے لیے من ہوگا۔ لام ملکیت کے لیے آتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کہ جتنی بھی صفات ہم بیان کرنے جا رہے ہیں ان کی حقیقت میں اللہ کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے لیکن صفت قدم میں ظاہر میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ جیسے ہم سماعت و بصارت میں بظاہر شریک ہوں گے' ہم بھی سمیع اور بصیر ہیں۔ اسی طرح آگے ایک اور بات آئے گی کہ صفتِ وحدانیت اور صفتِ بقا میں بھی کچھ شرکت ہے۔

صفتِ بقا

پھر الاول بالاولیۃ والآخر بالآخریہ صفت بقا یعنی وہ آخر ہے۔ جو آیت ہے: ﴿ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ﴾۔ اللہ القدیم ہے' اللہ الباقی ہے۔ الباقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء سے بھی ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴾ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بہتر ہیں اور باقی رہنے والے ہیں۔ یعنی اللہ کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں ہے اور کوئی خاتمہ نہیں ہے۔ اس میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا بھی خاتمہ نہیں ہے۔ یعنی ہماری ابتدا تو ہے لیکن ہمارا خاتمہ نہیں ہے۔ ایک خاص وقت پر اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے' ہم وجود میں آئے ہیں لیکن ہمارا وجود گویا ایک طرح کا ابدی وجود ہے' اس میں اختتام کبھی نہیں ہوگا۔ چاہے وہ جنت ہو چاہے وہ نعوذ باللہ دوزخ ہو' اب یہ وجود مستقل باقی رہے گا۔ تو کیا ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس صفت بقاء میں شریک ہو گئے کہ جس میں کبھی اختتام نہیں ہے؟ علماء نے کہا بالکل شریک نہیں ہوئے۔ الباقی وہ ہے جو اپنی ذات کی وجہ سے باقی ہے۔ اللہ کے سوا اگر کوئی باقی ہوگا بھی تو وہ اس کے اِبقا سے' اللہ کے باقی رکھنے سے باقی ہے۔ وہ اپنی ذات کے اقتضاء سے باقی نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو اپنی ذات کی وجہ سے باقی ہیں کیونکہ ان کی کوئی ابتدا نہیں' کوئی انتہا نہیں۔ وہ قائم بالنفس ہیں۔ یہ بھی اللہ کی صفات سلبیہ میں سے ہے: قیام بالنفس۔ ہم جو جنت میں باقی رہیں گے (ان شاء اللہ) تو وہ باقی رہنا اللہ کے ابقا سے ہے۔ ہمارا وجود کبھی لامتناہی نہیں ہوگا۔ ماضی میں اگر ہمیشہ کا وجود ہو تو پھر یہ لامتناہی ہوتا ہے' مستقبل میں کبھی لامتناہی وجود نہیں ہو سکتا۔ مستقبل میں ایک وجود ہمیشہ سے ہو لیکن اگر اس کی ابتدا ہے تو وہ ہمیشگی کے ہر مرحلے پر محدود ہوگا۔ اس کو جہاں بھی دیکھیں گے تو اس کی ابتدا سے لے کر وہ جگہ ایک محدود شمار ہوگی۔ وہ کبھی بھی لامحدود وجود نہیں بن سکے گا۔ چاہے وہ ہمیشہ رہتا رہے لیکن وہ ہمیشگی اسے کبھی حاصل نہیں ہو رہی ہوگی' کیونکہ ہمیشگی کے جس مرحلے میں بھی وہ ہوگا' وہ ہمیشگی نہیں ہوگی' وہ ایک محدود وجود ہوگا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس صفت میں ہم حقیقی طور پر شریک نہیں ہیں' کیونکہ اللہ تو ازلی وجود ہے۔ نہ اس کی

ابتدا ہے‘ نہ کوئی انتہا ہے۔ ہماری ابتدا ہے‘ لہٰذا جہاں بھی ہم ہوں گے زمان کے اعتبار سے ایک محدود وجود ہوں گے۔ دوسرا فرق علماء نے بیان کیا کہ ہم ہمیشہ تو ہوں گے لیکن ہمیشہ داخل الزمان ہوں گے۔ اللہ کی ہمیشگی داخل الزمان نہیں ہے‘ وہ تو خارج الزمان والمکان ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس صفت آخریت (بقا) اور صفت اولیت (قدم) میں کوئی شریک نہیں ہے۔ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ﴾۔ الظاہر کی تعریف بھی کر دیتے ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((اَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ)) (مسلم)

تو ایسا ظاہر ہے کہ تجھ پر کوئی غالب نہیں ہے۔ ظاہر غالب کو بھی کہتے ہیں۔

((وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ)) (مسلم)

تو ایسا باطن ہے کہ تجھ سے کوئی شے مخفی نہیں ہے۔

یعنی تو سب کچھ جانتا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس آیت کی تفسیر اس طرح مروی ہے۔

ایک بات نوٹ کر لیں کہ ان مباحث سے کہیں ایسا محسوس نہ ہو کہ یہ باتیں ہم پہلی دفعہ سن رہے ہیں‘ ہم تو اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہی نہیں تھے۔ نہیں! اللہ کے بارے میں یہ سب باتیں آپ پہلے سے مان رہے ہیں۔ اگر کسی سے بھی پوچھا جائے گا کہ اللہ کی کوئی ابتدا ہے تو وہ کبھی بھی نہیں کہے گا کہ اس کی کوئی ابتدا ہے‘ وہ کبھی بھی نہیں مانے گا کہ اللہ کی کوئی انتہا ہے۔ اللہ موجود ہیں‘ وجود رکھتے ہیں‘ یہ سب مانتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید یہ پہلی دفعہ سنا تو ہمارا عقیدہ ہی کوئی نہیں ہے۔ ہم تو ایسے ہی چلے جا رہے ہیں۔ آپ یہ ساری باتیں جانتے ہیں‘ البتہ یہاں ایک مرتب انداز میں جیسا کہ ہمارے علماء نے بیان کی ہیں وہ پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ اشکالات کسی بارے میں ہوں لیکن کوئی بات ایسی نہیں لگے گی کہ یہ تو ہم نے اللہ کے بارے میں پہلی دفعہ جانا کہ اللہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ لفظ قدیم یا ہمیشہ ہونے کی کچھ ایسی جہات یا کچھ ایسے معانی ظاہر ہو گئے ہوں جو پہلے سے ذہن میں حاضر نہ ہوں لیکن امید ہے کہ ان کی کسی قسم کی تکذیب بھی ذہن میں حاضر نہیں ہوئی ہوگی۔

صفت مخالفة للحوادث

اگلی صفت مخالفة للحوادث ہے۔ یہ صفت بھی بہت اہم ہے۔ مخالفة للحوادث کو اگر ہم قرآنی نام دیں گے تو وہ ہوگا: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ یا هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا۔ سمی کہتے ہیں ہم نام کو۔ اور ہم نام سے مراد ہے: ہم صفت۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا۔ اس کا کوئی ہم صفت جانتے ہو یا وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ‘ اس کے کوئی مانند نہیں ہے۔ کفو کہتے ہیں برابر کو۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اور اس کا کوئی ند (مدِمقابل) نہیں ہے:

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (البقرۃ:۲۲) اور دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل نہ ٹھہراؤ۔

اس بارے میں سب سے محکم آیت سورۃ الشوریٰ کی ہے:

﴿فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ

اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑫

''وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے۔ اُس نے تمہاری ہی نوع سے تمہارے جوڑے بنا دیے اور چوپایوں سے بھی جوڑے (بنائے)۔ اسی میں وہ تمہاری افزائش کرتا ہے۔ اُس کی مثال کی سی بھی کوئی شے نہیں۔ اور وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا۔ اُسی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی تمام کنجیاں۔ وہ کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) ناپ تول کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

مخالفة للحوادث کا مطلب ہے اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ حادث ہے۔ (کَانَ بَعْدُ اِنْ لَمْ یَکُنْ) نہ ہونے کے بعد ہو گیا۔ حادث مسبوق بالعدم ہے۔ جو نہیں تھا اور ہو گیا وہ حادث ہے' جس سے پہلے عدم تھا وہ حادث ہے۔ جو شے حادث ہے وہ اپنے اندر کچھ ایسی صفات رکھتی ہے جس کی بنا پر اس کے حدوث کو پہچانا جا سکتا ہے۔ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ حادث ہے؟ اگر ہم نے اس کی ابتدا نہیں دیکھی تو ہم کیسے جان لیں گے کہ وہ حادث ہے؟ یقیناً اس کے اندر کچھ حدوث کی علامات ہونی چاہئیں۔ اس کے اندر کچھ ایسے اشارے' ایسی نشانیاں' ایسی آیات ہوں جن کے ذریعے پتا چل جائے کہ یہ حادث ہے۔ جو چیزیں حوادث میں پائی جائیں گی اور جو ان کے حدوث پر دلیل ہوں گی' اگر وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میں ثابت ہو جائیں پھر اسے بھی نعوذ باللہ حادث ماننا پڑے گا۔ لہٰذا حوادث سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایسا فرق رکھیں گے۔ اس طریقے پر منزہ ہوں گے کہ جس کی بنا پر حادث اور غیر حادث میں امتیاز قائم ہو جائے اور ان صفات میں مشارکت لازم نہ آ جائے کہ جو بنائے حدوث ہیں۔ ہم حادث ہیں اس لیے کہ محدود وجود ہیں۔ ہم جسم ہیں' ہم مرکب ہیں' ہمارا ایک جزو دوسرے جزو پر dependent ہے۔ ممکن ہیں کہ ہم کچھ بڑے بھی ہو سکتے تھے' کچھ چھوٹے بھی ہو سکتے تھے' زمانے میں پہلے بھی آ سکتے تھے' بعد میں بھی آ سکتے تھے۔ بہت سی صورتیں ہیں۔ رنگ فرق ہو سکتا تھا۔ ہر چیز ہمیں بتا رہی ہے کہ یہ شے اس کے غیر بھی ہو سکتی تھی اور یہ حالت تغیر میں ہے لہٰذا یہ حادث ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ان تمام صفات کا اثبات نہیں ہو سکتا کہ جن کی بنا پر ہم حادث شمار ہو گئے۔ کائنات حادث ہے' اس کی تمام بنیادی صفات اس کے حدوث پر دال ہیں۔ وہ نہایت واضح انداز میں بتا رہی ہیں کہ میں حادث ہوں۔ میرا مالک' خالق کوئی اور ہے۔ میرا بنانے والا کوئی اور ہے۔

لہٰذا اس کائنات کا بنانے والا یقیناً اس کائنات اور اس کے اندر جتنی مخلوقات ہیں' ان کی مانند نہیں ہو گا۔ یہ مخالفہ للحوادث کا مطلب ہے۔ لیس کمثلہ شیء۔ اگر اس کے مثل کچھ ہوتا اور وہ مخلوق ہوتا تو جو اس کے مثل ہے وہ بھی مخلوق ہوتا۔ جب وہ مخلوق ہوتا تو اسے اور خالق کی حاجت ہوتی۔ اگر وہ خالق بھی مانند اپنے مخلوق کے ہوتا تو اسے اور خالق کی حاجت ہوتی۔ یا تو یہ سلسلہ ایسے خالق پر ختم ہو گا کہ جو اپنی مخلوق کی مانند نہیں ہو گا' لہٰذا اسے مزید خالق کی حاجت نہیں ہو گی۔ وہ اپنی ذات میں قائم بالنفس ہو گا۔ یہ مخالفة للحوادث کا مطلب ہے۔ یعنی جتنی بھی مخلوقات ہیں' جتنی بھی چیزیں ہیں جو عدم سے وجود میں آئی ہیں' وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی مانند نہیں ہیں۔ ہم جو پانچ صفات

سلبیہ پڑھ رہے ہیں' سورۃ الاخلاص میں یہ پانچوں صفات موجود ہیں۔

(قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) میں صفت وحدانیت کا ذکر ہے۔(اَللّٰهُ الصَّمَدُ) میں غنا' قیام بالنفس ہے۔(لَمْ یَلِدْ): اس کی مانند کوئی نہیں ہے۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے جیسا نہیں جنا ہے۔(لَمْ یُوْلَدْ): اس کی ابتدا نہیں ہے۔وہ کہیں سے صادر نہیں ہوا' وہ ہمیشہ سے ہے۔(وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ) میں بھی لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ کا بیان اور مخالفة للحوادث کا ذکر ہے۔ایک صفت بقارہ گئی لیکن وہ بقا اسی کے اندر ہے یعنی لَمْ یُوْلَدْ۔جو قدیم ہوتا ہے' جو ہمیشہ سے ہے وہ فنا نہیں ہوسکتا۔گویا یہ پانچ صفات سورۃ الاخلاص میں آگئیں۔لَمْ یَلِدْ ہم بقا کے معنی میں بھی اس طرح لے سکتے ہیں کہ ولد کا ہونا بقا کے لیے ہماری حاجت ہے۔لَمْ یَلِدْ میں گویا اسے حاجت ولد نہیں ہے کیونکہ وہ باقی ہے اور حاجت ولد اس کو ہے کہ جس کے وجود کی انتہا ہوتی ہے اور وہ اپنے وجود کی ایکسٹینشن اپنی اولاد کے ذریعے برقرار رکھتا ہے۔گویا لَمْ یَلِدْ وھو الباقی فلایحتاج الی الولد۔''وہ باقی ہے' اسے اولاد کی احتیاج نہیں'' کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔

توضیح لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۱۱﴾﴾ سورۃ الشوریٰ کی آیت ہے۔عربی زبان کا ایک مشہور قاعدہ ہے کہ: النکرة فی سیاق النفی تفید العموم یعنی نفی کے سیاق میں نکرہ آجائے تو وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔''عام'' کہتے ہیں جو اپنے تمام مشمولات' اپنے تمام افراد کو بیک وقت شامل ہو۔یعنی لفظ عام جب ہم بولتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے: العام وضع لمعنی معلوم علی (الشمول دفعةً واحدةً)۔یہ لفظ عام کی تشریح ہے۔جب ہم کہتے ہیں عموم کے لیے تو گویا کوئی شے باہر نہ رہی۔یعنی لیس کمثلہ' لیس نفی ہے' اس کے بعد نکرہ کہاں آرہا ہے: شیء۔لیس کمثلہ شیء۔گویا ترجمہ بنے گا: نہیں مانند اس کے کوئی بھی شے۔یعنی صرف شے نہیں' کوئی بھی شے۔عموم کا مطلب بھی یہی ہے۔جیسے میں اگر کہوں ماجاءنی رجل' اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک صاحب نہیں آئے بلکہ نکرہ کی وجہ سے مطلب ہوگا: مَا جاءنی ای رجل' کوئی بھی آدمی میرے پاس نہیں آیا۔گویا لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ' اس معنیٰ میں اللہ کے سوا تمام چیزوں پر حاوی ہے۔یعنی اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ مانند اللہ کے نہیں۔اس آیت میں مزید مبالغہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ لیس لذاته شیء اس کی ذات جیسا کوئی نہیں ہے۔یہ بھی کہا جاسکتا تھا لیس کنفسه لیس وجوده' وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہاں فرمایا: لیس کمثلہ۔یہاں مثل کا اثبات نہیں ہورہا۔کچھ لوگ جو الٹے سیدھے مطلب نکالتے رہتے ہیں' انہوں نے کہا کہ اس آیت سے تو مثل کا اثبات ہوا ہے' تم کہہ رہے ہو مثل کی نفی ہورہی ہے۔اللہ فرمارہے ہیں اس کی مثل کی مانند کوئی نہیں لہٰذا اس کی ایک مثل ہے اس کی مانند کوئی نہیں' اللہ کی مانند نہیں بلکہ اس کی مثل کی مانند کوئی نہیں۔یہ فضول بات ہے۔آپ جب کسی شخص کی تعریف کرتے ہیں تو اسی طرح کہتے ہیں' ھل رأیت مثلہ۔''کیا آپ نے اس کی مثل دیکھی ہے؟'' مقصود اس کی مثل کی نفی کرنا ہوتا ہے۔عربی زبان میں جو محاورہ ہے اس کی اصل ہے کہ آپ بتانا یہ چاہ رہے ہوتے ہیں کہ اگر اس کا کوئی مثل بھی

ہوتا تو اس کی مانند بھی نہ ہوتا۔ یعنی مبالغہ ہے اس کی مثل تو کوئی نہیں ہے۔ بالفرض اگر اس کا مثل بھی ہوتا تو اس مثل جیسا کوئی نہ ہوتا۔ مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس کا مثل ہو ہی نہیں سکتا' کیونکہ اگر اس کا مثل ہوتا اور اُس جیسا بھی کوئی نہ ہوتا تو پھر اِس جیسا بھی کوئی نہ ہوگا۔ یعنی جو صفت اس کے مثل کی ہے وہ کیا اس کی بالاولیٰ نہیں ہوگی۔ تو اگر اس کے مثل کی مانند کوئی نہیں ہوسکتا تو اس کی مانند بھی کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس میں گویا بلیغ درجے میں مثل کی نفی ہوتی ہے' اس کا اثبات نہیں ہوتا۔

اس آیت کے بارے میں تیسری بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ محکم کا مطلب یہ ہے کہ نہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے نہ اس میں نسخ کی گنجائش ہے۔ احناف کی تقسیم ہے: ظاہر' نص' مفسر' محکم۔ ظاہر اور نص میں بھی تاویل اور نسخ کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگر تاویل کی گنجائش ختم کر دیں تو وہ مفسر ہو جاتا ہے' لیکن مفسر میں ایک اور گنجائش رہ جاتی ہے۔ وہ ہے نسخ کی۔ تو اگر تاویل اور نسخ دونوں کا احتمال رفع ہو جائے تو اس لفظ کو یا اس مفہوم کو یا اس آیت کو یا مجموعہ الفاظ کو یا کلمات کو محکم کہتے ہیں۔

لا یحتمل التاویل و لا یحتمل النسخ۔ نسخ تو ویسے ہی اخبار میں نہیں ہوتا۔ یہ خبر ہے۔ نسخ کا مطلب ہے اللہ کسی حکم کو منسوخ کر دیں۔ کسی حکم کا منسوخ کرنا خبر میں نہیں ہوسکتا۔ اللہ نے ایک خبر دی' اس کو منسوخ کر دیا' یہ نہیں ہوسکتا ہے۔ ہاں امر اور نہی' احکام شرعیہ تکلیفی احکام کئی دفعہ منسوخ بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ آیت محکم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صفات کے بیان میں جتنی بھی اور آیات ہیں جن میں مشابہۃ للمخلوق کا شبہ وارد ہوسکتا ہے ان سب پر یہ آیت حاکم رہے گی۔ یعنی متشابہ کو محکم کی طرف لوٹایا جائے گا نہ کہ محکم کو متشابہ کی طرف۔ جو بھی صفت اللہ میں ثابت کرنی ہے اس صفت کے اوپر لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ والی آیت محکم رہے گی۔ لہٰذا اس آیت کا کوئی ایسا مفہوم نہیں بیان کیا جاسکے گا کہ جو لَيْسَ كَمِثْلِهٖ کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص:۷۵) میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آدم کو پیدا کیا۔ اور فرمایا کہ: ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ (الفتح:۱۰) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (الطور:۴۸)۔ اسی طریقے پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝۴۲ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۝۴۳﴾ (القلم)

''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور انہیں پکارا جائے گا (اللہ کے حضور) سجدے کے لیے تو وہ کر نہیں سکیں گے۔ ان کی نگاہیں زمین پر گڑی رہ جائیں گی' ان (کے چہروں) پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ اور ان کو (دنیا میں) پکارا جاتا تھا سجدے کے لیے جبکہ یہ صحیح سالم تھے۔''

یہ ساری باتیں امام بیہقی نے الگ الگ عنوانات کے تحت کیں: الکلام فی صفۃ الید' الکلام فی صفۃ الاستواء وغیرہ۔ وہ ہر جگہ یہی بات بتائیں گے کہ اللہ کے استوٰی' اللہ کے ید' اللہ کی عین کے بارے میں یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مخلوق کی طرح کوئی عضو یا جارحہ ہے یا ان میں مخلوق سے کسی بھی طرح کی مشابہت ہے۔ ان آیات کو آیت محکم لیس کمثلہ شیء کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے:

((یَنْزِلُ رَبُّنَا کُلَّ لَیْلَۃٍ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا)) (صحیح البخاری)

''ہمارا رب روزرات کو نزول کرتا ہے سماء دنیا پر۔''

نزول کو انسانوں پر قیاس مت کر لینا' اس کو بھی لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ وہ تمام تخیلات' تصورات اور اوہام جو تمہارے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں ان سب کو دور کر لو۔ اللہ کو جسمانیت سے' مکان وزمان سے مبرا قرار دو۔ محکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حاکم علی المتشابہات ہے۔ آیات متشابہات کو اس کی روشنی میں سمجھا جائے گا نہ کہ اس کو آیات متشابہات کی روشنی میں۔ مخالفۃ الحوادث اگر ہم نہ کریں تو تشبیہ پیدا ہوگی اور مخالفۃ للحوادث کو تنزیہہ کہتے ہیں۔ تشبیہ ایک مرض ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ماننا چاہیے جس غنا کے ساتھ' جس اطلاق کے ساتھ' جس احتیاج اور فقر کی نفی کے ساتھ اور جس عظمت اور جلال کے ساتھ' تشبیہ میں یہ چیزیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں خدا کو ایک بڑے انسان' جو ہے تو انسان لیکن شاید اپنی صفات میں کامل ہے' اس کی ایک شکل دے دی جاتی ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسے گروہ پیدا ہوتے چلے گئے جن کو مشبہہ کے نام سے یاد کیا گیا اور ان کو گمراہ فرقے قرار دیا گیا کہ جنہوں نے کہہ دیا کہ شاید اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی کسی جگہ باقاعدہ بیٹھے ہوئے ہیں نعوذ باللہ اور ایک چیز نے ان کو گھیرا ہوا ہے۔ ان کے بھی اعضاء اور جوارح ہوتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب گمراہیاں ہیں اور جن لوگوں نے اس مسئلے پر کتابیں لکھیں' جیسے ابن حزم اور شہرستانی' انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ اصلاً یہود کا تھا۔ یہود کے ہاں تشبیہ غالب تھی۔ لہٰذا یہ مسلمانوں میں یہود سے آیا ہے۔ واللہ اعلم!

مباحثِ عقیدہ (۶)

آیات متشابہات کا اثبات مع التنزیہ مسلک اہلِ سُنّت ہے

دلائل شرعیہ ودلائل عقلیہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مانند کوئی نہیں ہے' نہ اس کی ذات میں نہ اس کی صفات میں' نہ اس کے افعال میں۔ اس ضمن میں محکم آیت لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مانند کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طریقے پر فرمایا: ﴿وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ﴾ کہ اس کا کوئی کفو نہیں ہے۔ یہ بھی عرض کر دیا گیا کہ ﴿ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا﴾ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہم نام اور ہم صفت کوئی نہیں ہے۔ اسی طریقے پر قرآن مجید میں جابجا اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تنزیہہ کا بیان ہے جیسے ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ---- یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ---- وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ.....﴾ جن آیات یا احادیث سے کچھ مشابہت نظر آتی ہے' وہاں مشابہت مراد نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی جگہ پر یوں آ گیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ گویا حرکت فرماتے ہیں یا نزول فرماتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ نزول کے حوالے سے ہمارے ذہن میں جو تصورات آتے ہیں' ان کا انطباق اللہ تعالیٰ پر نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں نزول کا مطلب ہے ایک اعلیٰ جگہ سے نیچے کی طرف سفر

طے کرنا اور یہ سفر وہی طے کرے گا کہ جو کسی زمان ومکان کے اندر محدود ہے جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے ماورا ہیں۔ جو حسّی تصورات' ملابسات اور تخیلات ہمارے ذہن میں وارد ہوتے ہیں' اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ اہلِ سُنّت کے ہاں یہ متفق علیہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جسمانیات' حسیات' زمان' مکان سے ماورا ہیں اور وہ اپنی مخلوق میں سے کسی شے کے مانند نہیں ہیں۔ مخلوق اور خالق میں کوئی وجودی یا صفاتی تناسب اور مشابہت نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں ایک اصول دے دیا گیا کہ اگر اللہ کے بارے میں کسی آیت کے ظاہر سے ایسا محسوس ہو کہ گویا انسان اور اس کے خالق میں کوئی مشابہت ہے تو اللہ کی تنزیہہ بیان کرو' اس صفت کا اقرار کرلو تنزیہہ کے ساتھ۔

تاویل اجمالی (تفویض) وتاویل تفصیلی (تاویل)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تنزیہہ بیان کر دینا اور اللہ کی طرف علم کو لوٹا دینا تنزیہہ کے ساتھ' اس کو کہتے ہیں کہ تاویل اجمالی۔ یہ اکثر سلف کا مسلک تھا۔ تاویل اجمالی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تنزیہہ بیان کرو اور اسے ہر قسم کی مشابہت مخلوقات سے منزہ کرو اور اس آیت یا لفظ کا حقیقی معنیٰ متعین نہ کرو بلکہ علم کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹا دو۔ تاویل اجمالی کو تفویض بھی کہتے ہیں۔

سلف یہ کہتے تھے کہ آیات صفات میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ قراءتھا تفسیرھا یعنی اس کی قراءت ہی اس کی تفسیر ہے۔ لاکیف ولا معنیٰ ہم اس کی کیفیت اور اس کا معانی بیان نہیں کریں گے۔ خلف کا مسلک تاویل تفصیلی کا ہے۔ اس مسلک کی ضرورت کچھ خارجی عوامل کی وجہ سے پیش آئی ہے۔ تاویل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تنزیہہ بیان کر کے اس آیت یا اس صفت کا عربی زبان کے اصول وضوابط اور اصول شرع کے مطابق جو معنیٰ متعین کیا جائے اس کو ظنی قرار دے دیا جائے۔ یہ نہ کہا جائے کہ ہم نے اس آیت صفت کا جو معنیٰ متعین کیا ہے وہ قطعی ہے بلکہ اس کو ظنی کا درجہ دے دیا جائے۔ ہاں قطعیت اتنی ضرور ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔ یہ تاویل ہے جو خلف کا مسلک ہے اور اس میں بھی بہت سی شرائط ہیں۔

لفظ کا صَرف عن الظاہر مبنی بر دلیل ہوگا

لفظ کو اس کے ظاہر سے پھیرا جائے گا تو کسی دلیل کی بنیاد پر۔ وہ دلیل بات کو جائز قرار دے رہی ہو کہ اس لفظ کا ظاہر چونکہ مراد نہیں ہوسکتا لہٰذا ہم اس کو اس کے ظاہر سے پھیر رہے ہیں۔ اگر ہم بغیر کسی صحیح دلیل کے لفظ کو اس کے ظاہر سے پھیریں گے تو یہاں سے باطنیوں کی تاویلات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ دو مسالک ہیں اہلِ سُنّت کے: تفویض اور تاویل۔ تفویض کو ہم نے تاویل اجمالی کا نام دیا ہے جبکہ تاویل کو تاویل تفصیلی کا۔ تاویل اجمالی سلف پر غالب ہے۔ وہ عموماً ان آیات کا کوئی ظنی معنیٰ بھی متعین نہیں کرتے بلکہ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ اور لاکیف ولا معنیٰ بیان کر کے گزر جاتے ہیں۔ خلف نے بعض عوامل کی وجہ سے کچھ مشبہہ اور مجسمہ گروہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے ان آیات کی تاویل کی ہے لیکن اسے قطعیت کا نہیں بلکہ ظنیت ہی کا درجہ دیا ہے۔

چند اصول مزید پیش نظر رہنے چاہئیں جو صفات کے حوالے سے علماء نے بیان کیے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہر صفت کمال ثابت ہے لیکن اس میں ایک احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ کمال محض ہو۔ وہ صفت کمال کہ جس کا منشا نقص ہو' فقر ہو' احتیاج ہو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ثابت نہیں ہوگی۔ کچھ مشبہ اور مجسمہ گروہ گزرے ہیں جنہوں نے یہ تاویل پیش کی کہ مثلاً حرکت کرنا' یہ میرے لیے صفت کمال ہے یا نہیں! یقیناً میرے لیے صفت کمال ہے۔ اگر میں حرکت نہ کرتا تو جمادات میں سے ہوتا جو میرے لیے کمال نہیں ہے۔ میرے لیے تو کمال ہے کہ میں متحرک ہوں اور بالارادہ متحرک ہوں۔ لیکن کیا یہ کمال' کمال محض ہے؟ کیا یہ کمال مطلق ہے؟ ہرگز نہیں۔ میرا وجود کچھ حدود میں ہے جس کی وجہ سے میرے لیے حرکت کرنا کمال ہے۔ اس زمان ومکان میں بند ہونا میرا کمال ہے یا میرا فقر اور احتیاج؟ یہ یقیناً میرا فقر اور احتیاج ہے' کیونکہ میں ایک محدود وجود ہوں۔ اس فقر اور احتیاج کی وجہ سے میرے لیے حرکت کمال ہے۔ اب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے بھی کیا ہم اسی معنی میں حرکت ثابت کریں گے؟ علماء نے کہا: نہیں' بالکل ایسا نہیں ہوگا۔ جب ہم دلائل کی روشنی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں یہ جان چکے کہ: وھو منزہ عن الزمان والمکان لیس بمتمکن ولا بمتزمن وہ نہ وجود زمانی ہے نہ وجود مکانی ہے تو اس کے لیے حرکت کمال نہیں ہے۔ وہ تو ہر قسم کی حدود سے ماوراء ہے' لہٰذا وہاں حرکت کا یہ تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے کمال محض ثابت کرنا ہے۔ محض کمال نہیں۔ جو صفات اللہ نے اپنے لیے ثابت کی ہیں اور ہمارے اندر بھی موجود ہیں' جیسے سماعت ہے' بصارت ہے' ارادہ ہے' کلام ہے' قدرت ہے' حیات ہے تو ہم اللہ کے لیے بھی یہ صفات ثابت کریں گے مگر ہر اس قسم کے نقص اور احتیاج سے منزہ کر کے جو انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں لیکن روشنی اور آلہ بصر کے بغیر جس کو ہم آنکھ کہتے ہیں' نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے دیکھنے کے لیے شے کو ہماری کسی جہت میں ہونا ضروری ہے' خاص فاصلے پر ہونا ضروری ہے' ہر شے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ اللہ کے لیے جب بصر ثابت ہوگی تو ان تمام نقائص سے ماوراء۔ وہاں نعوذ باللہ یہ نہیں کہ اسے دیکھنے کے لیے آلہ چاہیے' روشنی چاہیے۔ یا وہ کچھ کو دیکھتا ہے' کچھ کو نہیں دیکھتا۔ ان تمام باتوں سے منزہ کر کے اللہ کے لیے وہ صفت ثابت ہوگی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے صفات کا اثبات ہوگا لیکن یہ کمال محض کے درجے پر ہوگا کہ جس میں کسی قسم کا کوئی نقص اور احتیاج نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ غنی مطلق ہے۔

صفت قیام بالنفس

صفات سلبیہ میں سے پانچویں صفت ہے: القیام بالنفس۔ یعنی اللہ تعالیٰ قائم بالنفس ہے۔ اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ چونکہ مُرَکَّبْ وجود نہیں ہے لہٰذا ان کا کوئی مُرَکِّبْ نہیں ہے۔ اس کا کوئی مُخَصِّصْ نہیں ہے۔ اللہ اپنے بل پر قائم ہے۔ موثر ہے' متاثر نہیں ہے۔ ہم بہت سی چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم پر انفعالی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ غنی مطلق ہے۔ کسی قسم کے احتیاج' فقر' کمی' کوتاہی' نقص کا وہاں گزر نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے کامل غنا ثابت کرنا ضروری ہے۔ جب تک یہ صفت ثابت نہیں ہوگی' اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے وہ تعلق بھی قائم نہیں ہوسکتا جو عبودیت کے لیے شرط ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۱۵﴾﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو الغنی اور الحمید ہے۔''

یہ غنائے مطلق اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا ضروری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے عقیدے میں بنیادی جگہ دینا۔ فی نفس الامر تو اللہ کے لیے ثابت ہے لیکن ہم نے اپنے عقیدے میں بھی اس بات کو ثابت کرنا ہے۔

اللہ ماورائے انفعال ہے

اللہ کے لیے ایسی صفت کا اثبات کہ جس میں انفعال ہو اس انفعال سے منزہ کر کے ہوگا۔ کچھ صفات ایسی ہوتی ہیں جس میں ہم پر انفعالی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ انفعالی کا مطلب ہے کہ ہم مفعول بن رہے ہوتے ہیں' فاعل خارج میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم پر رحمت طاری ہوئی' یعنی رحم آیا۔ یقیناً یہ صفت کمال ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کسی کو ہم کچھ دیتے ہیں' لیکن ہوتا یہ ہے کہ کسی کو برے حال میں اور تکلیف میں دیکھنے کی وجہ سے ایک انفعالی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ دل کی رقت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی خارج میں اس کو دیکھنے کی وجہ سے پہلے میں متاثر ہوتا ہوں اور پھر اس انفعال کے بعد فعل کرتا ہوں' اسے کچھ دے دیتا ہوں۔ جب ہم نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق جان لیا کہ وہ متاثر نہیں ہے تو اس پر انفعالی کیفیت نہیں آسکتی کیونکہ اس کا مطلب ہے خارج اس پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ جس پر خارج اثر انداز ہو رہا ہے وہ خدا کیسے ہوگا؟ خدا تو ماوراء ہے۔ اب ہم اللہ کے لیے رحمت ثابت کریں گے تو تاویل اجمالی یہ ہوگی کہ جو اللہ کے لائق ہے وہ رحمت اس کے لیے ثابت ہے جبکہ تاویل تفصیلی یہ ہوگی کہ ہم کہیں گے کہ اللہ کے لیے جو رحمت ثابت ہے اس میں وہ انفعال کی کیفیت نہیں ہوسکتی جو ہمارے اندر ہوتی ہے۔ ہم اللہ کے لیے رحمت کا اثبات کریں گے لیکن غنائے مطلق کے ساتھ' اس انفعالی کیفیت کی نفی کر کے۔ رحمت میں ہمارے لیے ایک انفعالی کیفیت ہے کہ رقت قلبی طاری ہوئی تو ہم دوسرے پر انعام واکرام کرتے ہیں۔ ایک تو اسے دینے کے لیے اور ایک اپنے آپ کو اندر سے مطمئن کرنے کے لیے۔ رقت قلبی اگر ختم نہ ہو تو ہم مستقل ایک عذاب ضمیر میں مبتلا رہیں گے۔ اللہ کے لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مجھ پر رحم کرتا ہے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے۔ نعوذ باللہ! وہ بس دے رہا ہے' کچھ لے نہیں رہا۔ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے کچھ حاصل نہیں کرتا' استفادہ نہیں کرتا' کچھ لیتا نہیں ہے۔

غضب بھی اسی طرح ہے۔ یہ کچھ ایسی شے دیکھنے کی وجہ سے ہوتا ہے جو میری مراد اور مرضی کے خلاف ہے۔ ایک انفعالی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کے بعد میرے اندر یہ ارادہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اس سے بدلہ لوں یا اس پر کوئی غضب نازل کروں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے لیے غصہ کا اثبات کیا ہے:

﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ﴿۹۳﴾﴾ (النساء)

''اور اللہ کا غضب اس پر ہوگا' اور اللہ نے اس پر لعنت فرمائی ہے اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اللہ کے لیے غضب تو ثابت ہو گیا لیکن کیا ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اللہ نے وہ شے دیکھی جو اس کی مراد نہیں تھی۔ کائنات میں کوئی شے اللہ کی مرضی اور مشیت سے خارج نہیں ہے اور غیر مراد شے دیکھنے کے بعد ایک انفعالی کیفیت طاری ہوئی۔ نہیں! اللہ سبحانہ وتعالیٰ قائم بالنفس ہیں، موثر ہیں، متاثر نہیں ہیں۔ جب آپ اللہ کو اس صفت کے ساتھ مانیں گے کہ وہ بس دیتا ہے، لیتا کچھ نہیں تو پھر امتنان، شکر اور احسان مندی کے جو جذبات پیدا ہوں گے وہ اس صورت میں نہیں ہو سکتے اگر آپ یہ مانیں کہ اللہ مجھے دے کر کچھ لے بھی رہا ہے۔ یعنی دو طرفہ تعلق ہے۔ نعوذ باللہ! حدیث میں آتا ہے کہ اگر تمام انسان، تمام آنے والے انسان اور جن، عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ ہو جائیں، سب سے زیادہ متقی ہو جائیں تب بھی: مَازَادَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا، میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر سب کے سب فرعون ہو جائیں تو تب بھی: مَانَقَصَ مِنْ مُلْکِیْ شَیْئًا (صحیح مسلم) میری مملکت میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ پتا چلا کہ ہمارا ایمان، ہماری طاعت، ہمارے اعمال صالحہ یہ سب ہمیں ہی نفع دیتے ہیں۔

کارِ تخلیق سے اللہ کو کچھ مفاد نہیں

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو کوئی شے نفع نہیں دیتی۔ ہم جب یہ عقیدہ رکھتے ہیں تو دیکھیں کیسے شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ عدم کا پردہ چاک کر کے اس نے ہمیں وجود دے دیا محض دینے کے لیے، محض رحمت کی وجہ سے وہ ہم سے کچھ نہیں لیتا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اللہ رب العالمین ہے۔ کیوں رب العالمین ہے؟ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ رحمان اور رحیم ہے۔ محض رحمت کا ایک جوش، بہاؤ، پھیلاؤ اور فیضان ہے جس کی وجہ سے ہمیں وجود دے دیا محض اپنے ارادے سے۔ اللہ نے کوئی استفادہ نہیں فرمایا۔ ایسے تصورات کچھ باطل فرقوں اور کچھ فلاسفہ کے ہاں رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نعوذ باللہ تخلیق کے اس کھیل سے کچھ حاصل کر رہے ہیں۔ وہ تدریجاً کمال کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ یہ کائنات اور خدا مل کر اپنے آپ کو کامل کر رہے ہیں۔ خدا کی صفاتِ کمال میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان سارے اقوال کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ خدا اپنی ذات میں کامل نہیں کیونکہ کامل وہ ہے جس میں مزید کمال کی گنجائش نہ ہو۔ اگر مزید کمال کی گنجائش ہے تو پچھلا اس کی نسبت سے نقص ہو گیا۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نعوذ باللہ ناقص تھے اور مکمل ہو رہے ہیں۔ یہ تصورات باطل ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ وہ غنی ہے۔

﴿اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۸﴾ (ابراہیم)

''تم کفر کرو، زمین میں سب کفر کرو، اللہ غنی اور حمید ہے۔''

﴿لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝۷﴾ (ابراہیم)

''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے تو یقیناً میرا عذاب بھی بہت سخت ہے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۱۲﴾ (لقمٰن)

''اور جو کوئی بھی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی بھلے کے لیے۔ اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔''

اللہ تعالیٰ قیوم اور قائم ہے۔ یہ دو صفات ہیں۔ قائم ہے کہ ان کو کسی اور نے تھاما نہیں ہے' وہ اپنے بل بوتے پر ہیں۔ ہمیشہ سے ہیں' کسی نے انہیں پیدا نہیں کیا' کسی نے انہیں قوت نہیں دی' کسی نے انہیں سہارا نہیں دیا اور باقی اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ سب اسی کے بل بوتے پر ہے۔ الصمد کا مفہوم بھی یہی ہے: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اللّٰهُ الصَّمَدُ ○﴾ اللہ وہ ہستی ہے جو ہر غیر سے بے نیاز ہے اور ہر غیر اس کا محتاج ہے۔ یہ تصور قیام بالنفس کا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر قسم کے تاثر سے' ہر قسم کے انفعال سے' ہر قسم کے استفادے سے ماوراء ہے۔ وہ اپنی ذات میں کامل ہے۔

کائنات سبب کمال نہیں' دلیل کمال ہے

اس سے اہلِ سُنّت نے ایک اور اصول نکالا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اگر یہ کائنات پیدا نہ کرتا تب بھی اس کی ذات کامل ہی رہتی۔ یعنی یہ کائنات اسے کمال نہیں دے رہی' یہ اس کے کمال پر دلیل ہے۔ ہاں اس کائنات کے پیدا کرنے کی قدرت رکھنا اللہ کے لیے کمال ہے اور وہ ہمیشہ سے اللہ کے لیے ثابت ہے۔ اگر ہم یہ بات مان لیں کہ کائنات کا بالفعل پیدا ہو جانا اللہ کے لیے کمال ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کے لیے کائنات کو وجود دینا ضروری ہے کیونکہ وہ خدا ہے اور خدا کے کمال میں اس کی مخلوق کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جب تک مخلوق موجود نہیں ہوگی تو وہ کامل نہیں ہوگا۔ گویا مخلوق بھی ہمیشہ سے موجود ہے کیونکہ خالق کامل وجود ہے۔ جب مخلوق ہمیشہ سے موجود ہے تو وہ فاعل مختار نہ ہوا' بس اس سے چیزوں کا صدور ہو گیا جیسا کہ فلاسفہ نے کہا ہے کہ اس کے ارادے کے بغیر اس سے ایجاب ہوتا رہتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارادے سے پیدا کیا' چاہے تو ختم کر دے۔

مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ

اللہ نے اپنی مرضی سے یہ کائنات پیدا کی ہے اور نہ بھی پیدا کرتا تو وہ کامل ہوتا۔ کبھی بھی یہ تصوّر پیدا نہ ہو جائے کہ ہم نے وجود میں آ کر اللہ کے کمال میں کچھ اضافہ کر دیا۔ نعوذ باللہ! اللہ تھا' اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے بخاری کی حدیث میں فرمایا:

((كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرُهُ))

اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ وہ تھا اپنے کمال کے ساتھ جب کچھ بھی نہیں تھا اور بعض علماء نے اضافہ کیا کہ:

وَهُوَ الْآنَ عَلٰى مَا كَانَ

وہ ابھی بھی اسی کیفیت پر ہے جس پر وہ پہلے تھا۔ اس مخلوق کے پیدا ہو جانے سے کچھ اضافہ اس کی ذات وصفات اور کمال میں نہیں ہوا۔ ہمارے علماء نے کہا کہ اس طرح کے مسالک جن میں اللہ تعالیٰ سے اختیار سلب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' اور اللہ کو فاعل مختار ثابت نہیں کیا جاتا' یا اللہ تعالیٰ کو بھی کچھ استفادہ کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے وہاں اللہ سے ذاتی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں سے تو مستقل فیضان ہو رہا ہے۔ یہاں جو قابل ہیں وہ اپنی اپنی استعداد کے

مطابق لیتے ہیں۔ جیسے آپ یوں کہیں کہ سورج کی روشنی تو ایک جیسی پڑ رہی ہے لیکن اپنی اپنی سطح کے اعتبار سے کچھ چمک پیدا کر رہے ہیں' کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ محض سورج کی مانند نہیں ہے جس سے شعاع کا خروج ہونا ہی ہونا ہے۔ نہیں' وہ جو دے رہا ہے اپنی مرضی سے دے رہا ہے۔

﴿یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ﴾ (آل عمران: ۷۴)

''وہ مختص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے۔''

ہر شے اس کی مشیت اور اس کے ارادے کے تحت ہو رہی ہے۔ وہاں ایجاب نہیں ہو رہا۔ چیزوں کا خود بخود صدور نہیں ہو رہا۔

خدا کو فاعل بالارادہ ماننا تعلق باللہ کے لیے ضروری ہے

اس بات کا سمجھنا اللہ تعالیٰ سے صحیح طریقے پر تعلق استوار کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے یہ محض کلامی' عقلی مبحث نہیں ہے۔ آپ اس کو یوں دیکھیں کہ آپ کا خدا وہ خدا ہے جس کے اندر یہ صفات پائی جاتی ہیں' اس سے آپ کا تعلق کیا ہوگا۔ اس تعلق کو پیدا کرنے کی ہمیں فی زمانہ بہت زیادہ ضرورت ہوگئی ہے۔ ہمارے ہاں اِلّا ماشاء اللہ اسباب کے حضور کی کیفیت ہے اور خدا کے ساتھ غیاب کی کیفیت ہے۔ یعنی ہم جس شے کے ساتھ ہر وقت حضور رکھتے ہیں وہ اسباب ہیں۔ اسباب ہمیں حتمی نظر آ رہے ہیں۔ یہ نہیں کرو گے تو ایسا ہو جائے گا' ایسا کرو گے تو ایسا ہو جائے گا۔ خدا کا تصور شعور کے تہ خانے میں بند پڑا ہے۔ یہ تصور کہ کوئی شے حرکت نہیں کر سکتی' کوئی شے ہل نہیں سکتی' کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر اللہ کے اذن سے۔

﴿وَمَا ہُمۡ بِضَآرِّیۡنَ بِہٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۰۲)

''اور نہیں تھے وہ ضرر پہنچانے والے اس کے ذریعے کسی کو بھی اللہ کے اذن کے بغیر۔''

ہر شے اللہ کے اذن کے تابع ہے۔ تصورات عقیدہ کی سطح پر دماغ کے کسی کونے میں بند ہیں جو اپنی مسلمانیت کے ثبوت کے لیے ہم دکھاتے بھی رہتے ہیں لیکن یہ سب باتیں حضور کی کیفیت میں ہمیں حاصل نہیں ہیں۔

اسباب مؤثّر بالذّات نہیں

کوئی نہ سمجھے کہ اسباب اختیار نہیں کرنے۔ اسباب اختیار کرنے ہیں لیکن ان میں تاثیر کا عقیدہ رکھ کے نہیں۔ اسباب اس لیے اختیار کرنے ہیں کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اختیار کرو۔ اس لیے کہ اللہ کے رسولؐ کی سُنّت ہے۔ باقی مؤثرِ حقیقی' فاعلِ حقیقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے' اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ سب باتیں حضور کے درجے میں ہمیں پیدا کرنی ہیں کہ ہر شے اللہ کی محتاج ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اللہ تخلیق کائنات کے بعد نعوذ باللہ بیٹھ گیا اور دیکھ رہا ہے کہ کائنات لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے بلکہ ہر آن تدبیر امر فرما رہا ہے: ﴿یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ﴾ اور فرمایا: ﴿کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ﴿۲۹﴾﴾ (الرحمٰن) اس کی تفسیر جو روایات میں آئی ہے کہ ہر آن وہ تدبیر فرما رہا ہے۔ یہ عقیدہ پیدا کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

صفاتِ سلبیہ میں چوتھی صفت قیام بالنفس کی ہے۔اس میں ہم نے سلب کیا ہے اللہ سے احتیاج کو۔فقر کو‘اللہ سبحانہ وتعالیٰ میں نہ احتیاج ہے نہ فقر ہے‘وہ ان تمام چیزوں سے ماوراء ہے۔اگر آپ اس کو قرآنی اصطلاح دینا چاہیں گے تو وہ یہ ہوگی :الغنی۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ غنی مطلق ہے‘اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ ‘چاہے تو تمہیں اٹھا کے لے جائے۔﴿قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ﴾(المائدۃ:۱۷)’’تو ان سے پوچھئے کون ہے جسے اختیار ہو اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی اگر وہ ہلاک کرنا چاہے مسیحؑ ابنِ مریم کو اور اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو‘‘۔تو اللہ کچھ نہیں لیتے۔ابھی بھی فی زمانہ کچھ فلسفہ سے متاثر اور کچھ باطل فرقوں سے متاثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ میں بھی تدریجی کمال پیدا ہو رہا ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی ایک progress کے عمل میں ہیں۔یہ سب باطل تصورات ہیں۔اللہ کے بارے میں وہی بات برحق ہے جو وحی کے ذریعے معلوم ہو چکی ہے کہ اس میں غنائے مطلق ہے۔

پہلی صفت ذاتیہ ہم نے دیکھی جو کہ الوجود ہے۔اس کے بعد ہم صفات سلبیہ کی طرف آئے جو پانچ صفات ہیں۔اس میں سب سے پہلے ہم نے دیکھی قدم‘اللہ کی ابتداء نہیں ہے۔اس کے بعد دیکھی بقاء‘انتہا نہیں ہے۔اس کے بعد دیکھی :مخالفة للحوادث‘جس کو ہم نے قرآنی عنوان دیا:لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مانند کوئی نہیں ہے۔اس کے بعد ہم نے چوتھی صفت دیکھی :القیام بالنفس کہ قائم ہے اور قیوم ہے۔قیوم مخلوق کے لیے اور قائم بنفسہٖ ہے۔اللہ کی صفت قیومیت وہی ہے جو صفت ربوبیت ہے۔یہاں بعض علماء نے کہا کہ دو عنوان ہو سکتے ہیں :غنی اور رب۔قائم بالنفس یعنی غنی ہے۔جو دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے وہ قیوم ہے یا رب ہے۔بعض علماء نے یہ بھی کہا کہ الحی القیوم بھی اسم اعظم ہے۔اللہ کے نبی ﷺ سے بھی مروی ہے کہ جو اسم اعظم ہے اس آیت میں ہے:﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾اور دوسری آیت آلِ عمران کی آیت ہے:﴿الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲﴾اسی طریقے پر آیۃ الکرسی بھی ہے۔

صفت قیام بالنفس عبد میں موجب اضطرار وفقر ہے

چوتھی صفت کے نتیجے میں انسان میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو علماء نے اضطرار اور فقر کہا ہے۔حضرت جعفر صادق علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا کہ اسم اعظم کیا ہے!انہوں نے کہا کہ اسم اعظم ہے کہ تم اپنے اندر اضطرار کی کیفیت پیدا کرو‘پھر جس اسم سے بھی پکارو گے وہ اسم اعظم ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا کہ وہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے:﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾مضطر کہتے ہیں جس کے پاس کوئی سبب نہ رہا ہو۔بالکل مجبور ہو چکا ہو اور کوئی دنیوی سبب اسے نظر نہیں آ رہا ہو تو وہ اللہ کو پکارے گا تو اللہ دعا قبول کرتے ہیں۔اگر انسان سبب رکھتے ہوئے یہ کیفیت پیدا کر لے تب بھی وہ مضطر بن سکتا ہے۔یہ مضطر ہونا اختیاری ہے کہ میری واقعی سبب پر نگاہ نہ رہے اور میرے لیے سبب کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جائے۔گویا میں ہر وقت حالت اضطرار میں ہوں۔اللہ کا وعدہ ہے کہ ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾(النمل:۶۲)’’بھلا کون ہے جو سنتا ہے ایک مجبور و

لاچار کو جب وہ اس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے؟'' گویا حالت اضطرار میں ہونا ہی حالت فقر ہے۔ اس کے متوازی اللہ تعالیٰ کی صفت غنائے مطلق ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے کہ ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾﴾ (القصص) ''تو اُس نے دعا کی: پروردگار! جو خیر بھی تو میری جھولی میں ڈال دے، میں اس کا محتاج ہوں۔'' یہاں من خیر نکرہ آیا ہے۔ یعنی کوئی حقیر چھوٹے سے چھوٹا خیر بھی ہو تو میں اس کا فقیر ہوں، مانگتا ہوں۔ یہ فقر کی کیفیت ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت غنا کے ساتھ ہمارے اندر پیدا ہونی چاہیے۔

صفتِ وحدانیت

پانچویں صفت، صفت وحدانیت ہے، صفت توحید ہے۔ توحید کی صفت کو صفت سلبی اس لیے کہا گیا کہ اس میں کسی شے کا اثبات نہیں ہو رہا بلکہ کثرت کی نفی ہو رہی ہے۔ یہ تعریف بہت سی کتابوں میں ہے اور کافی جامع ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ توحید ہے: افراد المعبود بالعبادۃ مع اعتقاد وحدتہ ذاتًا و صفاتا و افعالًا یعنی معبود حقیقی کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، اور اس کی وحدت کا اعتقاد رکھنا ذات میں، صفات میں، افعال میں۔ گویا ہم توحید کی تین اقسام بھی بیان کر سکتے ہیں۔ توحید ذاتی، توحید صفاتی، توحید افعالی۔ اس اعتقاد کے ساتھ جتنے بھی مراسم عبودیت ہیں، جتنے بھی اعمال عبودیت ہیں ان سب کو اللہ کے لیے خاص کر لینا۔ تو افراد المعبود بالعبادۃ میں عمل کی طرف اشارہ ہے۔ اور اعتقاد و حدتہ میں اعتقاد کی طرف اشارہ ہے۔ گویا توحید اعتقاد اور عمل سے مل کر بنتی ہے۔ ہو سکتا ہے میں اعتقاد تو رکھوں لیکن عبادت کسی اور کی بھی کر رہا ہوں۔ عبادت میں بھی معبود کو ایک بنانا، اور پھر اس معبود کی ذات، صفات اور افعال میں وحدت کا عقیدہ رکھنا ہی توحید ہے۔

توحید ذاتی

اس سے ایک سادہ مراد یہ ہے کہ واجب الوجود واحد ہے۔ کائنات کا خالق، مالک، الٰہ ایک ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ دو ہیں۔ جیسے مجوسی ہیں، یا ثنوی ہیں، یا عیسائیوں کے ہاں بھی ایک قسم کی کثرت ثابت ہو گئی۔ ذات تو ایک ہو گئی اور وہ ماننا ضروری ہے۔ جیسے مشرکینِ مکہ بھی کچھ اعتبارات سے مانتے تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو اس کائنات کا خالق و مالک، رازق اور مدبّر ہے وہ ایک ہے جس کو کچھ لوگوں نے حیدر بوبیہ کہا لیکن اللہ کو معبود واحد ہونے کی حیثیت سے نہیں مانتے تھے۔ تاہم یہ تقسیم اتنی درست نہیں ہے۔ اور ایک الگ مبحث ہے۔

توحید ربوبیت اور توحید الوہیت والی تقسیم کچھ علماء نے کی ہے، جیسے ابن تیمیہ علیہ الرحمہ، لیکن بہت سے علما اہلِ سنّت نے کہا کہ اس تقسیم میں کچھ مسائل ہیں۔ پھر توحید ذاتی کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بھی نعوذ باللہ کوئی مختلف اجزاء سے مرکب نہیں ہے، وہاں وحدت حقیقی ہے۔ جسمانیات اجزاء سے بنی ہوتی ہیں اور ان میں تقسیم بھی ہو سکتی ہیں۔ ہر شے جو جسم ہے اس کو آپ اجزا میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ وہاں اس قسم کی کوئی کثرت نہیں ہے۔ کثرت فرضی بھی نہیں ہے۔ اسی طریقے پر وہاں منطقی کثرت بھی نہیں ہے۔ ہم انسان کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ حیوان ناطق ہے۔ اس کے لیے انسان کو ایک جنس کے تحت لانا پڑے گا اور انسان نوع بنے گی اور نوع کی تعریف ہو گی جنس اور

فصل کے ذریعے۔ یہ منطق میں تقسیم ہوتی ہے۔ وہاں یہ منطقی کثرت بھی نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات مبارکہ بھی بس ایک ہے۔ آپ کہہ رہے ہوں گے کہ یہ وجود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہی تو بیان ہے کہ لیس کمثلہٖ شیءٌ اس کے مانند کوئی بھی نہیں ہے۔ تو وہ ایک وحدت ہے۔ اس لیے اللہ کہتا ہے: قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ' احد اور واحد میں فرق ہے کہ واحد میں شے ایک ہوتی ہے لیکن احتمال کثرت کا ہوسکتا ہے جبکہ احد میں احتمال کثرت بھی نہیں۔ یعنی وہ ذات ایسی ہے کہ جس میں کثرت تخیلاتی 'منطقی' فرضی بھی نہیں ہے۔ پھر ساتھ یہ بھی ماننا لازم ہے کہ وہ معبود برحق ہے۔

توحید صفاتی

اس کے بعد توحید صفاتی کا ذکر ہے۔ یعنی جس طرح اس کی ذات کی وحدت کا اقرار کرنا ہے اسی طرح اس کی صفات کی وحدت کا بھی اقرار کرنا ہے۔ اس کے بیان میں ایک تو کچھ کلامی بحث ہوتی ہے۔ صفت علم کی وحدت کا مطلب ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں علم کی کثرت اس اعتبار سے ہوتی ہے کہ مجھے ہر شے کا الگ الگ علم ہے' تو میرے علم میں کثرت ہے۔ اس طرح کی تقسیم اللہ کے ہاں نہیں ہے۔ اللہ کی صفت وحید ہے اور بسیط بھی یعنی ہماری صفات علم کے مانند نہیں ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جو صفت اللہ کے لیے ثابت ہے اس میں اللہ کا شریک کوئی نہیں۔ یعنی چاہے انسانوں میں اس صفت جیسے اسماء پائے جائیں تو وہ مشارکت صرف اسم میں ہے' حقیقت میں نہیں ہے۔ رحیم اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی ہیں اور یہ اسم انسانوں میں بھی مستعمل ہے۔ یہاں صفت میں مشارکت نہیں ہے' اسم میں مشارکت ہے۔ جس طرح ذات میں شراکت شرک ہے' اسی طرح اللہ کی صفت کو مانند صفت مخلوق کے یا مخلوق کی صفت کو مانند صفت اللہ کے قرار دے دینا یہ بھی شرک ہو جائے گا۔ یہ اللہ کے اسماء میں الحاد ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلِلّٰہِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡہُ بِہَا ۪ وَذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ ؕ ﴾ (الاعراف:۱۸۰)

''اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں' تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے۔ اور چھوڑ دو اُن لوگوں کو جو اُس کے ناموں میں کجی نکالتے ہیں۔''

یہاں اللہ کے اسماء میں الحاد سے مراد لیا گیا کہ جو اللہ کا اسم کسی اور کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ اسم کا مطلب ہے صفت۔ یعنی اگر کہا جائے کہ اللہ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ہے پھر کسی اور کے بارے میں بھی کہہ دیا کہ وہ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ہے تو شرک ہو جائے گا۔ نہ اللہ کی صفت مخلوق میں ثابت کرنی ہے نہ مخلوق کی تشابہ والی صفات ادھر ثابت کرنی ہیں بلکہ ماننا ہے کہ دونوں صفات میں سوائے اسم کی شراکت کے حقیقت میں کوئی شراکت نہیں ہے۔

توحید افعالی

فعل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرنے کا مطلب ہے کہ جو فاعل مختار ہے' بالارادہ ہے بغیر کسی جبر کے وہ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ یعنی وہ ہستی کہ جس کا فعل محض اس کے ارادے سے صادر ہوتا ہے اور اس کے ارادے پر کوئی جبر نہیں ہوتا۔ کوئی اس کو ترغیب دینے والی' ڈرانے والی چیز نہیں ہے۔ فعل پر اُکسانے والا کچھ

نہیں ہے۔ محض ارادہ ہے۔ یہ صفت فعل محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ثابت ہے۔ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی شریک نہیں۔ یہ جو افعال کائنات میں نظر آ رہے ہیں' اس میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

اعتقادِ وحدت مانع رجوع الی غیر اللہ ہے!

اگر کسی شخص میں یہ اعتقاد پیدا ہو جائے تو پھر اس کا غیر اللہ کی طرف رخ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یعنی وہ اگر اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہے جو بیان کر دیا گیا ہے اور جا کر اپنا ماتھا ٹیک رہا ہے کسی اور کے در پر تو گویا یقیناً اس نے اللہ کو نہیں پہچانا۔ اگر وہ واقعی اللہ کی وحدت ذاتا وصفاتا وافعالا کا قائل ہے اور پھر اللہ کے سوا کسی کے سامنے گھٹنا ٹیک دے تو یہ شرک تو ہے ہی بے وفائی بھی ہے۔ لہٰذا اس اعتقاد وحدت کے بعد اپنی تمام عبادت کو اور افعال عبادت کو اللہ کے لیے خاص کر لینا افراد المعبود بالعبادۃ ہے۔ ہمارے ہاں عموماً توحید ذات وصفات کی تقسیم ہے۔ توحید افعال اس کے تابع ہے۔ اسی سے آپ شرک کی بھی اقسام نکال سکتے ہیں یعنی شرک فی الذات' شرک فی الصفات اور شرک فی الافعال جبکہ افراد المعبود بالعبادۃ کے ذریعے شرک فی العبودیہ ہو جائے گا۔

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾﴾

(الکہف)

''پس جو کوئی بھی اُمید رکھتا ہو اپنے رب سے ملاقات کی تو اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔''

اللہ کے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ مراسم عبودیت جیسے سر جھکانا' نماز پڑھنا' طواف کرنا' کسی کی نذر ماننا' دعا کرنا وغیرہ وغیرہ' یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہو سکتے۔ اس عبادت کے پیچھے جو اصل جذبہ مخفی ہے وہ شدید درجے کی محبت اور خضوع ہے۔ یہ عبادت کی روح ہے۔ اصلاً عبادت کا تعلق بندے اور خدا کا ہے۔ یعنی اس میں انفرادی شے پہلے ہے۔ اجتماعیت بعد میں آتی ہے۔ اس حوالے سے پچھلے زمانے میں کچھ ایسا ہوا کہ توحید کے تصور میں بھی بندے اور خدا کے تعلق کو ثانوی قرار دے دیا گیا۔ جبکہ خدا کی کچھ تعریفات ایسی کی گئیں کہ جس میں اصلاً خدا کی صفت حاکمیت کو اس کے معبود ہونے کی اصل قرار دے دیا گیا۔ اس کی وجہ سے عبودیت کے ماثور طور بدل گئے' انداز بدل گئے اور عبودیت کی کچھ نئی نئی شکلیں پیدا ہوئیں۔ اللہ اور بندے کے درمیان جو حقیقی تعلق ہونا چاہیے اس پر کچھ اور چیزیں غالب آتی چلی گئیں۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

سائنس کیا ہے؟

علم کے جس شعبہ کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا دوسرا نام علم کائنات ہے' جس میں انسان کا علم بھی شامل ہے۔ سائنسی علوم کی کلید کائنات کے قدرتی حالات اور واقعات کا یا دوسرے لفظوں میں مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ ہے' جو ہمارے حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے۔ سائنس دان کائنات کے مشاہدہ سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے' پھر ان نتائج کو ایک قابلِ فہم تنظیم اور ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ ہر درست سائنسی نتیجہ کو ہم ایک مستقل علمی حقیقت یا قانونِ قدرت سمجھتے ہیں۔ مشاہدہ سے دریافت ہونے والے نتائج یا علمی حقائق کو جب مرتّب اور منظّم کر لیا جاتا ہے تو اسے ہم سائنس کہتے ہیں۔

سائنسی طریق تحقیق کے چار مرحلے

بعض وقت سائنس دان کائنات کے حالات اور واقعات کا مشاہدہ براہِ راست ان کی قدرتی حالت میں کرتا ہے اور اس غرض کے لیے ان کو ڈھونڈھ نکالتا ہے اور خود ان کے قریب جاتا ہے۔ لیکن بعض وقت وہ اپنے معمل کے اندر کائنات کے حالات اور واقعات کو مصنوعی طور پر پیدا کر کے ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ گویا ان کو اپنے قریب لاتا ہے۔ لیکن خواہ سائنس دان مظاہر قدرت کے قریب خود جائے یا اُن کو اپنے قریب لائے' دونوں صورتوں میں وہ کائنات کے مشاہدہ اور مطالعہ کی خاطر اپنے لیے سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سائنس دان کی اس کوشش کو تجربہ کا نام دیا جاتا ہے۔ تجربہ کی غرض مشاہدہ ہے اور مشاہدہ کی غرض غور و فکر کے بعد نتائج اخذ کرنا۔ بعض وقت بہت سے الگ تھلگ سائنسی حقائق مل کر ایک ایسی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں جو براہِ راست تجربہ اور مشاہدہ کے طریقوں سے ثابت شدہ نہیں ہوتی۔ تاہم چونکہ وہ بعض ثابت شدہ حقائق کو منظّم کرتی ہے' اس لیے سائنس دان اسے ایک قابلِ یقین نظریہ کے طور پر اپنے سائنسی حقائق میں داخل کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کے بغیر اس کے الگ تھلگ سائنسی حقائق قابلِ فہم نہیں ہوتے اور ان میں کوئی عقلی تنظیم یا وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ نظریہ بھی جب تک کہ سائنسی حقائق اسے غلط ثابت نہ کریں' ایک سائنسی حقیقت کا درجہ رکھتا ہے' کیونکہ وہ بھی

ہمارے مشاہدات کے نتائج میں شامل ہوتا ہے۔

سائنس دان کے اس طریق تحقیق کو جس کی روح کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ ہے، سائنسی طریق تحقیق یا سائنٹیفک میتھڈ (Scientific method) کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سائنس دان کے طریق تحقیق کے چار مرحلے ہوتے ہیں:

اوّل — تجربہ (Experiment)

دوم — مشاہدہ (Observation)

سوم — اخذ نتائج (Inference)

چہارم — تنظیم نتائج (Systematization of Inferences)

سائنسی علوم کی قسمیں

کائنات کے تین واضح طبقے ہیں: (۱) مادّہ (۲) زندہ اجسام (۳) نفسِ انسانی ---- اور ان کے بالمقابل علم کائنات یا سائنس کے بھی تین بڑے حصے ہیں:

(۱) مادّہ کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا طبیعیاتی علوم، جن میں علم طبیعیات، علم کیمیا، علم الافلاک، علم الارض وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) زندگی کی ماہیت سے تعلق رکھنے والے علوم یا حیاتیاتی علوم، جن میں علم حیاتیات، علم نباتات، علم الحیوانات، علم الجنین، علم الابدان، طب وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) نفسِ انسانی کی ماہیت اور اس کے مظاہر سے تعلق رکھنے والے علوم یا انسانی یا نفسیاتی علوم، جن میں نفسیاتِ فرد، نفسیاتِ جماعت، علم التاریخ، علم السیاست، علم الاخلاق، علم الاقتصاد، علم القانون، علم التعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ریاضیات اور منطق بھی نفسیات ہی کی شاخیں ہیں، کیونکہ وہ ان اصولوں کی تشریح اور تفصیل پر مشتمل ہیں جن کے مطابق انسانی ذہن سوچتا ہے۔

ہم سائنس کے ان شعبوں کو اختصار کی غرض سے علی الترتیب، طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

سائنسدان کے بنیادی اعتقادات

بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنس کو اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں اور دورِ حاضر کا سائنس دان اپنی تحقیق کسی ایسے اعتقاد سے شروع نہیں کرتا جس کو اُس نے بلا ثبوت پہلے سے قبول کر لیا ہو، بلکہ وہ خالی الذہن ہوتا ہے اور اُس کے مشاہدات جس طرف اسے لے جاتے ہیں، چلا جاتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ ہر سائنس دان اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد کے طور پر حقیقتِ سائنس یا حقیقتِ علم کے متعلق کچھ عقائد رکھتا ہے جو خود حقیقتِ کائنات کے کسی عقیدہ سے ماخوذ ہوتے ہیں اور جو اُس کی تحقیق کے نتائج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر سائنس دان شروع سے ہی اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ کائنات ایک یکساں کُل یا وحدت ہے۔ یعنی وہ فاصلہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے ایسے منطقوں یا

حصوں میں بٹی ہوئی نہیں جن میں متضاد قسم کے قوانین قدرت جاری ہوں۔ کائنات کے قوانین مسلسل اور مستقل ہیں' وہ نہ صرف ہر جگہ ایک ہی ہیں بلکہ ہر زمانہ میں بھی ایک ہی رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس دان کا یہ عقیدہ صحیح ہے اور اس کی صحت کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ آج تک غلط ثابت نہیں ہوسکا۔ یہ عقیدہ سائنسی تحقیق کا باعث ہے' اس کا نتیجہ نہیں۔ سائنس کی تمام ترقیات جو اب تک ممکن ہوئی ہیں ان کی بنیاد یہی عقیدہ ہے۔ اگر سائنس دان اس عقیدہ سے آغاز نہ کرتے اور یہ عقیدہ صحیح نہ ہوتا تو سائنس ممکن ہی نہ ہوتی۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو سائنس دان کو سائنسی تحقیق کے لیے اکساتا ہے اور اسی کی تصدیق سے وہ اپنے سائنسی نتائج پر مطمئن ہوتا ہے اور اس کی راہ پر آگے قدم اٹھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سائنس دان کو معلوم ہو جائے کہ جو سائنسی حقیقت اُس نے اپنی تحقیق سے آج اس وقت اور اس مقام پر دریافت کی ہے وہ محض وقتی اور مقامی ہے اور اس کی متبادل یا متوازی سائنسی حقیقتیں اس کائنات میں بہت سی ہیں یا آئندہ ہوسکتی ہیں —— مثلاً اگر اُسے یہ خیال ہو کہ پانی سطح سمندر سے یکساں بلندی پر کہیں تو سو درجہ حرارت پر اور کہیں پچاس درجہ حرارت پر ابلتا ہے اور کسی خاص مقام پر کسی وقت ۱۰۰ درجہ حرارت پر اور کسی اور وقت پچاس درجہ حرارت پر اُبلتا ہے —— تو وہ اپنی اس تحقیق کے نتیجہ کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دے گا۔

کائنات کی وحدت کے نتائج

پھر کائنات کی اسی وحدت کی وجہ سے سائنس دان بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ سائنس ایک وحدت ہے اور تمام سچے سائنسی حقائق خواہ وہ طبیعیاتی ہوں' یا حیاتیاتی یا نفسیاتی' ایک دوسرے کے ساتھ عقلی طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ علمی ربط وضبط رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے' ایک دوسرے کی تائید اور توثیق کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر روشنی ڈالتے ہیں اور کسی صورت میں بھی آپس میں ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کی علمی اور عقلی مخالفت نہیں کرتے۔ سائنس دان بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تمام سائنسی حقائق مل کر ایک ایسا عقلی اور علمی نظام بناتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی نام نہاد ''سائنسی حقیقت'' اس میں داخل کر دی جائے جو سچی سائنسی حقیقت نہ ہو تو وہ اس نظام میں سما نہیں سکتی' کیونکہ تمام سائنسی حقائق اس کی علمی اور عقلی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی اعتقاد کی وجہ سے جب سائنس دان دیکھتا ہے کہ اس کی تحقیق کے ذریعہ سے کوئی ایسی سائنسی حقیقت آشکار ہوئی ہے جو کسی دوسری سائنسی حقیقت سے جو پہلے سے معلوم اور مسلّم ہو' ٹکراتی ہے تو وہ اپنی تحقیق کو ناقص سمجھتا ہے اور اس ''نام نہاد'' سائنسی حقیقت کو غلط سمجھ کر ردّ کر دیتا ہے یا پھر پہلی معلوم اور مسلّم سائنسی حقیقت پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ اس پر نظر ثانی کرتا ہے اور اگر وہ غلط ہو تو اسے رد کر دیتا ہے۔ سائنسی حقائق کی وحدت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب سائنس کا کوئی حصّہ غلط طور پر ترقی کر رہا ہو تو ساری سائنس کی ترقی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے' یہاں تک کہ سائنس کے بعض حصوں کی ترقی بالکل رُک جاتی ہے۔ سائنسدان بلا ثبوت اور بلا دلیل یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ہر سچی سائنسی حقیقت بہت سی اور سائنسی حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اگر اُس نے ایک ایسی حقیقت کو ردّ کر دیا تو بہت سی اور سائنسی حقیقتیں اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی اور سائنس کی ترقی اس کے کسی نہ کسی شعبہ یا حصّہ میں رُک

جائے گی۔ یہ وہ اعتقادات ہیں جن سے سائنسدان اپنی تحقیق کا آغاز کرتا ہے۔ یہ اعتقادات اُس کی تحقیق کے آغاز سے پہلے اُس کے دِل کے اندر بطور مسلّمات موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ثابت نہیں کرتا بلکہ قبول کرتا ہے اور ان کی مدد سے اور ان کی روشنی میں اپنے تمام سائنسی حقائق کو ثابت کرتا ہے۔

سائنس کی وحدت کا سبب: حقیقتِ کائنات کی وحدت

سائنسدان وحدتِ کائنات اور وحدتِ سائنس پر بلا ثبوت اور بلا دلیل اعتقاد کیوں رکھتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بحیثیت انسان اپنی فطرت سے ایسا کرنے کے لیے مجبور ہے۔ انسان کی فطرت کے اندر یہ اعتقاد ودیعت کیا گیا ہے کہ حقیقتِ کائنات ایک ہے اور ساری کائنات اسی کا مظہر ہے۔ خواہ سائنسدان اپنے اس وجدانی اعتقاد کا اعتراف کرے یا نہ کرے لیکن یہ اعتقاد پھر بھی اُس کی فطرت کے جزوِ لاینفک کے طور پر اُس کے لاشعور میں جاگزیں رہتا ہے اور وہ اس اعتقاد کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب تک حقیقتِ کائنات کو شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نہ مانا جائے، سائنسی حقائق کی وحدت کو ماننا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت بغیر نظم یا اتحاد کے نہیں ہوتی جبکہ نظم متحد کرنے والے یا منظّم کرنے والے کسی مرکزی اصول کے بغیر محال ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ جو اُصول تمام سائنسی حقائق کو متحد اور منظّم کرے وہ اُن کی جان یا روح یا آخری حقیقت کے طور پر ہو۔ وہ حقیقت الحقائق یعنی کائنات کی آخری حقیقت ہو اور تمام سائنسی حقائق اس کی تشریح اور تفسیر کے اجزاء اور عناصر ہوں جو اس کے ساتھ علمی ربط اور عقلی مطابقت رکھتے ہوں۔ دراصل سائنسی حقائق کے باہمی علمی اور عقلی ربط وضبط کی وجہ یہی ہے کہ وہ سب حقیقتِ کائنات کے ساتھ عقلی اور علمی ربط وضبط رکھتے ہیں۔ سائنسدان کا شعوری یا لاشعوری تصوّرِ حقیقت ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے سائنسی نتائج پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ سائنسی حقائق صرف صحیح تصوّرِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور کسی غلط تصوّرِ حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتے، لہٰذا اگر سائنسدان کا تصوّرِ حقیقت درست ہوگا تو اُس کی سائنسی تحقیق درست ہوگی اور اس کو درست نتائج تک پہنچائے گی، ورنہ جا بجا غلط ہو جائے گی اور آخر کار رُک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت نفسیاتی یا سائنسی علوم کے دائرہ میں جو تصوّرِ حقیقت کے ساتھ زیادہ قریب کا تعلق رکھتے ہیں، زیادہ شدّت سے نمودار ہوگی۔ تصوّرِ حقیقت کے غلط ہونے سے سائنس کے غلط ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سائنسدان غیر شعوری طور پر بعض صحیح سائنسی حقائق کو بدل کر اپنے غلط تصوّرِ حقیقت کے مطابق کرتا جاتا ہے اور بعض غلط نام نہاد ''سائنسی حقائق'' کو جو اس کے مطابق ہوں، صحیح سمجھ کر قبول کرتا جاتا ہے۔

فلسفہ کا کام یہ ہے کہ وہ آشکار طور پر کسی تصوّرِ حقیقت کو پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ تمام سائنسی حقائق کی عقلی اور علمی مطابقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فلسفیوں نے صحیح تصوّرِ حقیقت کے مختلف نظریات قائم کیے ہیں اور قدرتی طور پر ہر فلسفی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تمام سائنسی حقائق صرف اُسی کے تصوّرِ حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں، لہٰذا اُسی کا تصوّرِ حقیقت صحیح ہے۔ لیکن چونکہ صرف ایک ہی تصوّرِ حقیقت تمام سائنسی حقائق کو متحد اور منظّم کر سکتا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ درست تصوّرِ حقیقت صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا تصوّرِ حقیقت

روسی اشتراکیوں کے نزدیک یہ تصوّرِ حقیقت مادہ ہے‘ لیکن مسلمانوں کے نزدیک یہ تصوّرِ حقیقت خدا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے نزدیک یہی تصوّرِ حقیقت ہے جس سے تمام سائنسی حقائق مطابقت رکھتے ہیں اور جو تمام سائنسی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور ان کی طرف صحیح راہ نمائی کرتا ہے۔ باقی ہر قسم کے تصوراتِ حقیقت سائنس کی مجموعی ترقی کے لیے مضر ہیں۔ دراصل ایک ہی تصوّرِ حقیقت ایسا ہے جو وحدتِ عالم اور وحدتِ علم کی معقول اور قابل قبول تشریح کر سکتا ہے اور وہ مسلمانوں کا تصوّرِ حقیقت ہے‘ جس کی رو سے وہ یہ مانتے ہیں کہ سائنسی حقائق اور قوانین قدرت کی حقیقت اور اصلیت یہ ہے کہ وہ کائنات میں خدا کے تخلیقی اور تربیتی اعمال وافعال ہیں‘ اور خدا ایک شخصیت ہے اور شخصیت کا خاصہ ہے کہ اُس کا صرف ایک مقصد یا مدّعا ہوتا ہے جس کے ماتحت اُس کے سارے اعمال وافعال سرزد ہوتے ہیں۔ جہاں بھی ہمیں اعمال وافعال کا ایک منظّم سلسلہ نظر آئے وہاں کسی شخصیت کی کارفرمائی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ فردِ انسانی کے اعمال وافعال کے اندر بھی ایک وحدت ہوتی ہے‘ کیونکہ وہ بھی ایک شخصیت ہے اور بیک وقت ہمیشہ ایک مقصد اور مدعا کے ماتحت اپنے سارے کام کرتا ہے۔

چونکہ کائنات کی تخلیق سے خدا کا ایک مقصد ہے‘ لہٰذا اس کے سارے اعمال وافعال میں جو قوانینِ قدرت یا سائنسی حقائق کی صورت اختیار کرتے ہیں‘ ایک وحدت موجود ہے۔ اس کے برعکس چونکہ قوانینِ قدرت یا کائنات کے اعمال وافعال کے اندر ایک وحدت موجود ہے‘ لہٰذا ضروری ہے کہ ان اعمال وافعال کا باعث کوئی شخصیت ہو جو کائنات کی خالق ہو۔

وحدتِ کائنات سے خدا کے وجود کا قرآنی استشہاد

وحدتِ کائنات کا باعث یہ ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور وہ مقصد ایک ہی ہے‘ اور اس کے مقصد کی وحدت کا باعث یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور وہ خالق ایک ہی ہے۔ وحدتِ کائنات پر سائنسدانوں کے غیر شعوری وجدانی اعتقاد کا باعث اُن کی فطرت کا یہ مخفی اور غیر شعوری تقاضا ہے کہ وہ کائنات کا ایک مقصد مانیں اور وہ مقصد ایک ہی ہو اور اس کا ایک خالق تسلیم کریں اور وہ خالق ایک ہی ہو۔

قرآنِ حکیم نے کائنات کی وحدت کی طرف پُرزور الفاظ میں توجّہ دلائی ہے اور اس کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے:

﴿مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ﴿۴﴾﴾ (الملک)

’’(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) آپ خدا کی تخلیق میں کوئی فرق نہ دیکھیں گے۔ ذرا نظر دوڑائیے (اور کائنات کا مشاہدہ کیجیے) کیا آپ کو خدا کی اس تخلیق میں کبھی کوئی دراڑ نظر آتی ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑائیے اور دیکھئے نگاہیں مایوس اور درماندہ ہو کر لوٹیں گی کہ خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی دراڑ نہیں۔ (کیا کائنات کی یہ وحدت اس

کی مقصدیت کا اور پھر اس کی مقصدیت کسی خالق کائنات کی ہستی اور وحدت کا ثبوت نہیں۔)''

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ﴾ (فاطر: ۴۰)

''(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) کہئے: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر کس کی عبادت کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ تو سہی کہ آیا انہوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں اُن کا کوئی حصّہ ہے!''

یعنی اگر کائنات کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کوئی اور شریک ہوتا تو زمین و آسمان میں کہیں تو اُس کی اپنی تخلیق کا کوئی نشان ملتا جہاں جُدا قسم کے قوانینِ قدرت نافذ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ منکرین قرآن حکیم کے اس سوال کے جواب میں اسی کائنات کا ایک حصّہ پیش کر کے معقولیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ حصّہ خدا کے اُس شریک نے پیدا کیا ہے جسے ہم مانتے ہیں' کیونکہ جب کائنات کے اس حصّہ میں بھی قوانین قدرت وہی ہیں جو باقی کائنات میں ہیں تو کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا خالق وہی نہیں جو باقی کائنات کا ہے۔

فلسفہ: سائنس ہی کا ایک شعبہ

فلسفہ اور سائنس کے اس باہمی تعلق کی بناء پر ہم فلسفہ کو سائنس سے الگ نہیں کر سکتے۔ جب تک سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دریافت کیے ہوئے حقائق کی تشریح' توجیہہ یا تنظیم کے لیے نظریات قائم کرے' فلسفہ اور سائنس میں کوئی واضح امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ پوری کائنات کی سائنسی تحقیق کی وہ چوتھی اور آخری منزل ہے جہاں تمام کائنات کا سائنسی علم تجربہ' مشاہدہ اور استنتاج کے تینوں مرحلوں سے گزر کر تنظیم نتائج کے چوتھے مرحلے میں داخل ہوتا ہے۔ دراصل جب سائنسی تحقیق اپنی مجموعی حیثیت سے اپنے آخری درجہ پر پہنچتی ہے تو ہم اسے فلسفہ کہتے ہیں۔

مسلمان: سائنسی طریق تحقیق کے مُوجد اور سائنسی علوم کے بانی

بعض یورپی مصنفوں کی غلط بیانیوں کی وجہ سے دنیا مدّت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہے کہ سائنسی علوم اور سائنسی طریق تحقیق کے موجد یورپ کے لوگ ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ سائنسی طریق تحقیق کا موجد روجر بیکن (Roger Bacon) یا اس کا ایک اور ہم نام ہے۔ لیکن سائنسی علوم کی تاریخ کے موضوع پر حال کی علمی تحقیق نے اس ناقابل تردید تاریخی حقیقت سے پردہ چاک کر دیا ہے کہ سائنسی طریق تحقیق جس کی بدولت موجودہ سائنسی علوم وجود میں آ کر ترقی پذیر ہوئے ہیں' مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا اور یورپ کے حالیہ سائنسی علوم کی بنیاد بھی مسلمانوں نے رکھی تھی۔ پھر بعض لوگوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق یونانیوں سے سیکھا تھا اور اپنے سائنسی علوم کی بنیاد ان کی سائنس پر رکھی تھی' لیکن یہ خیال بھی درست نہیں۔

The Making of Humanity (تعمیرِ انسانیت) کا مصنف برفالٹ (Briffault) اس قسم کی تمام غلط فہمیوں کی پُرزور تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''عصرِ جدید کی دنیا میں عربوں کی تہذیب کا عظیم الشان حصہ سائنس ہے' لیکن اس کے پھل کو پکنے میں کچھ دیر لگی۔ جب تک ہسپانوی عربوں کی تہذیب تاریکی میں دوبارہ گم نہیں ہوئی وہ دیومہیب جس کو اس نے جنم دیا تھا' اپنی پوری قوت کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا۔ یہ فقط سائنس ہی نہیں تھی جس نے یورپ کو زندہ کیا' اسلام کی تہذیب کے اور بہت سے اثرات نے یورپ کی زندگی کو اس کی پہلی چمک دمک سے آراستہ کیا۔'' (ص:۲۰۲)

''اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثر کے نشانات موجود نہ ہوں' لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا کہ اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے یعنی سائنس اور سائنسی طرزِ فکر۔'' (ص:۱۰۹)

''ہماری سائنس فقط انقلاب آفریں نظریات کی حیرت انگیز دریافت کے لیے ہی علومِ عرب کی احسان مند نہیں' بلکہ سائنس اس سے بھی بڑے احسان کے لیے عربوں کی تہذیب کی مرہونِ منّت ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے وجود ہی کے لیے اس کے زیرِ احسان ہے۔ دنیائے قدیم یعنی یونانیوں کی تہذیب' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' سائنس سے پہلے کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات اور ریاضیات دوسرے ملکوں سے درآمد کی ہوئی چیزیں تھیں جن کو یونانی تہذیب کی آب وہوا کبھی پوری طرح سازگار نہ آسکی۔ اہلِ یونان حقائق کو منظّم کرتے تھے' ان سے عمومی نتائج اور اصول اخذ کرتے تھے اور نظریات قائم کرتے تھے۔ لیکن تحقیق وتجسّس کے صبر آزما راستے' مثبت علم کی فراہمی' سائنس کے نکتہ رس طریقے' مفصل اور طویل مشاہدہ اور تجرباتی چھان بین ایسی چیزوں کا اہلِ یونان کی افتادِ طبیعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ قدیم کلاسیکی دنیا کا علمی کام اگر کسی مقام پر ذرا سا بھی سائنسی تحقیق کے نزدیک پہنچا تو وہ یونانیوں کے دور کا اسکندریہ تھا۔ جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تحقیق کی ایک ایسی نئی روح اور تجسّس کے ایسے نئے طریقوں یعنی تجربہ' مشاہدہ' پیمائش اور ریاضیات کی اس قسم کی ترقی کے طفیل ظہور پذیر ہوئی تھی جس سے اہلِ یونان محض بے خبر تھے۔ اس روح کو اور ان طریقوں کو یورپ میں عربوں نے داخل کیا۔'' (ص:۱۹۰)

''یورپ میں علوم کا احیاء پندرھویں صدی میں نہیں بلکہ اُس وقت ہوا جب عربوں اور موروں کی تہذیب کے اثر سے یورپی تہذیب میں زندگی کی نئی روح پھونکی گئی۔ یورپ کی نئی زندگی کا گہوارہ اٹلی نہیں' بلکہ اسپین تھا۔ مدّت تک بربریت کی پستیوں میں غرق ہوتے رہنے کے بعد یورپ جہالت اور ذِلت کی تاریک ترین گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا جب عرب ملکوں کے شہر بغداد' قاہرہ' قرطبہ اور طلیطلہ تہذیب اور علمی مشاغل کے ترقی پذیر مراکز بنے ہوئے تھے۔ ان شہروں میں اُس نئی زندگی کا آغاز ہوا جو نوعِ انسانی کے ارتقا کے ایک نئے پہلو کی صورت میں جلوہ افروز ہونے والی تھی۔ اُس وقت سے جب عربوں کی تہذیب کا اثر محسوس ہونے لگا' نئی زندگی حرکت میں آنے لگی۔'' (ص:۱۸۸)

''لیکن وہ نقطۂ نظر جس کی روشنی میں عرب موجودہ مواد کو کام میں لاتے تھے' یونانیوں کے نقطۂ نظر کے بالکل متضاد تھا۔ یہ نقطۂ نظر بعینہٖ وہ چیز مہیّا کرتا تھا جس کا فقدان یونانیوں کے ذہن کا کمزور اور ناقص پہلو تھا۔ یونانیوں کی دلچسپی کا مرکز نظریہ آفرینی اور اصول سازی تھے۔ وہ ٹھوس مشاہداتی حقائق سے بے پروا تھے اور

ان کو نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے برعکس عرب محققین کا ذوقِ دریافت نظریہ آفرینی سے بے پروا تھا اور اس کا مقصود ٹھوس حقائق کو بہم پہنچانا اور اپنی معلومات کو صحت اور کمیّت کے معیاروں پر لانا تھا۔ معتبر اور پائیدار سائنس اور ایک ڈھیلے ڈھالے سائنسی ذوق میں جو چیز فرق پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کہنے والا کیفیت نہیں بلکہ کمیّت بیان کر رہا ہے اور اپنی پیمائش کو ہر ممکن طریق سے درست کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ عربوں کا سارا وسیع و عریض سائنسی کام اسی معروضی تحقیق اور کمیتی صحت وصفائی کے ذوق کے زیر اثر انجام پاتا رہا ہے۔ روجر بیکن نے آکسفورڈ اسکول میں ان لوگوں کے جانشینوں کے ماتحت عربی زبان اور عربی سائنس کا علم حاصل کیا تھا۔ نہ روجر بیکن اور نہ ہی اس کا دوسرا ہم نام اس بات کا اہل ہے کہ اسے سائنسی طریق تحقیق کے موجد ہونے کا اعزاز بخشا جائے۔ روجر بیکن تو محض عیسائی یورپ کے لیے مسلمانوں کی سائنس کے سفیروں یا پیام رسانوں میں سے ایک تھا اور وہ کبھی یہ کہتے ہوئے نہ تھکتا تھا کہ عربی زبان اور عربی سائنس کا سیکھنا اس کے ہم عصروں کے لیے سچے علم کا ایک ہی راستہ ہے۔ یہ بحثیں کہ سائنسی طریق تحقیق کا موجد کون تھا' یورپی تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں ایک بہت بڑی غلط بیانی پر مشتمل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بیکن سے پہلے عربوں کا تجرباتی طریق تحقیق عام ہو چکا تھا اور یورپ بھر میں اس کا تتبع نہایت ذوق وشوق سے کیا جاتا تھا۔''

مسلمانوں کو یہ امتیاز کیسے حاصل ہوا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سے فقط مسلمانوں کو ہی یہ امتیاز نصیب ہو سکا کہ انہوں نے قدرت کے گہرے مشاہدہ اور مطالعہ کو اپنا شعار بنایا' یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ سائنسی طریق تحقیق ایجاد کریں اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھیں!

قرآن کی تعلیمات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی اس بات میں ذرا شک باقی نہیں رہتا کہ اس کا سبب خود قرآن حکیم ہے جس کے قریباً ایک تہائی حصّہ میں قدرت کے گوناگوں مظاہر کی طرف توجّہ دلا کر کائنات کے مشاہدہ اور مطالعہ پر زور دیا گیا ہے۔ دراصل مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت کے لیے سب سے پہلی مؤثر آواز جو دنیا میں بلند کی گئی ہے وہ قرآن ہی کی آواز ہے۔ (جاری ہے) ۞۞۞

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 160 روپے، اشاعت عام 80 روپے

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : اعمال کی قبولیت

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

ضخامت: ۲۲۷ صفحات قیمت: ۴۰۰ روپے

ناشر: ⊙ دار النور، اسلام آباد ⊙ مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار لاہور

پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی اسلامی علوم کے ماہر معروف سکالر ہیں۔ اسلامی موضوعات پر تقریباً سو کتابوں کے مصنف ہیں جو عربی، اردو، انگریزی کے علاوہ بنگالی، انڈونیشی، فرانسیسی، فارسی اور ترکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تمام کتب معیاری، مدلّل اور اسلامی لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب عنوان کے اعتبار سے ان کی شاہکار تصنیف ہے جس کے مطالعے سے قاری اپنے نیک اعمال کی قبولیت سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ نیز وہ ان اعمال کے قریب پھٹکنے سے بھی اجتناب کرے گا جو اُس کی حسنات کو معدوم کرنے والے ہوں گے۔

کتاب درج ذیل چار مباحث پر مشتمل ہے:

مبحث اوّل : قبولیتِ اعمال کی اہمیت

مبحث دوم : قبولیتِ اعمال کی شرائط

مبحث سوم : قبولیتِ اعمال میں رکاوٹ بننے والے کام

مبحث چہارم : مقبول اعمال کو برباد کرنے والے گناہ

کتاب کی جامعیت قابلِ تعریف ہے کہ اس کو پڑھنے والا اپنے اعمال کا جائزہ لے سکتا ہے کہ اس کے کون سے اعمال نتیجہ خیز ہیں اور کون سے ایسے ہیں جو نیکیاں سمجھ کر کیے جاتے ہیں مگر درحقیقت وہ گناہ کے کام ہوتے ہیں۔

کتاب کا کاغذ عمدہ سفید ہے۔ جلد مضبوط اور خوبصورت ہے۔ کمپوزنگ بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔

(۲)

نام کتاب : تربیتی نصاب

مرتب : المصطفیٰ مرکز

ضخامت: 244 صفحات

ملنے کا پتہ: چک شاہ پور' 2- کلومیٹر' ہرن مینار' موٹروے انٹرچینج' حافظ آباد' شیخوپورہ

برائے رابطہ :0300-5115922,0321-4110922

المصطفیٰ مرکز دیہاتی علاقے میں واقع ہے۔ یہ قرآن وحدیث پر مشتمل لٹریچر شائع کرتا ہے' جس کا مقصد مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیمات کا فروغ ہے' تاکہ لوگ ان کو جان کر اور ان پر عمل کر کے سچے مسلمان بن سکیں۔ زیرنظر کتاب سات حصوں اور ایک نصیحت پر مشتمل ہے۔

☆ پہلے حصّے میں منتخب آیات قرآنی مع ترجمہ درج ہیں۔ یہ آیات انتہائی نیک جذبے سے منتخب کی گئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ کون سے کام اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور کن کاموں سے اس نے رکنے کا حکم دیا ہے۔

☆ دوسرے حصّے میں منتخب احادیث ہیں جنہیں پڑھ کر اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور ان کی اہمیت سے آگاہی ہوتی ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کی محبّت دل ودماغ میں اترتی ہے۔

☆ تیسرا حصّہ روزمرہ کی سُنّتوں پر مشتمل ہے' جن کو اختیار کر کے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں اور وظائف سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے اور انسان کی اخلاقی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ یہ تمام سُنّتیں بھی احادیث کی مستند کتابوں سے لی گئی ہیں۔

☆ چوتھے حصّے میں مسنون دعائیں ہیں' جن کو یاد کرنا چاہیے۔ اُن کے ذریعے اپنے رب سے رابطہ استوار کرنے میں مدد ملتی ہے اور یہ جذبہ بیدار ہوتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی دعاؤں کو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

☆ پانچویں حصّے میں عورتوں کے مسائل کا حل قرآن وسُنّت کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ عورتوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولات کو اسلامی تعلیمات کے مطابق اختیار کریں۔ ناخواندہ اور بھولی بھالی عورتیں تو طہارت کے اہم مسائل سے بھی واقف نہیں ہوتیں۔

☆ چھٹا حصّہ مختصر طور پر سیرت رسول ﷺ کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ سیرت النبیؐ کے اہم واقعات سے واقف ہو۔

☆ ساتواں حصّے کا عنوان ''تذکرۃ الصحابہ'' ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے ان جاں نثاروں کا ذکر ہے جنہوں نے آپؐ کے دست وبازو بن کر اسلام کی ترویج میں شاندار کارنامے انجام دیے اور اس کام میں تکلیفیں اٹھا کر بے مثال قربانیاں دیں۔

آخری حصّے کا عنوان ہے: ''دعوتِ فکر'' جس میں نہایت مؤثر انداز میں مسلمان بھائیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کی گئی ہے' کیونکہ اس کے بغیر حقیقی کامیابی محال ہے۔

مصطفیٰ مرکز یہ کتاب بلا قیمت دیتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر کئی کتابیں جن کے پڑھنے سے اسلامی تعلیمات سے نہ صرف واقفیت ملتی ہے بلکہ عمل کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے مفت مہیا کرتا ہے۔ کتاب سفید کاغذ پر خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

(۳)

نام کتاب : یادداشت پارلیمانی معرکہ: اسلام وقادیانیت

مصنف : حکیم عبدالرحیم اشرفؒ

تدوین نو : ڈاکٹر زاہد اشرف

ضخامت: ۲۲۴ صفحات قیمت: درج نہیں اہتمام : مکتبہ المنبر عبدالرحیم اشرف ٹرسٹ

ملنے کا پتہ: کتاب سرائے الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

کتاب کے مصنف مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ معروف عالم دین' ماہر طبیب اور معالج تھے۔ وہ نفاذِ اسلام کے داعی' مشہور خطیب اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ختم نبوت کے اوّل درجہ کے قائدین میں سے تھے۔ قادیانیت کے عزائم سے واقف اور ان کے مٹانے کا عزم بالجزم رکھتے تھے۔ اس پر ان کی تحریری اور تقریری کوششیں شاہد عادل ہیں۔ ردِّ قادیانیت تو ان کی زندگی کا اہم ترین مشن تھا۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جب قومی اسمبلی میں قادیانیت کے رد میں بل پیش کیا گیا تو اُس وقت ممبرانِ قومی اسمبلی کی مکمل راہنمائی کے لیے حکیم صاحب نے شبانہ روز محنت کر کے یہ یادداشت تیار کی جس کی روشنی میں پارلیمان کے ارکان کے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ چنانچہ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کو ملّتِ اسلامیہ سے نکال دیے جانے کا تاریخی فیصلہ ہو گیا۔

اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے عقائد کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ نیز قادیانیوں کی کتابوں کے اوراق فوٹو سٹیٹ کروا کے اس میں شامل کیے گئے' جس سے یہ نتیجہ از خود نکلتا تھا کہ قادیانی اُمّتِ مُسلمہ میں شامل نہیں۔ اب یہ کتاب قادیانی مسئلے پر ایک مستند دستاویز ہے۔ اس کے مطالعہ سے قارئین مرزا غلام احمد کی شخصیت' اس کے عقائد ونظریات اور اس کی اسلام کے خلاف جِدّوجُہد کو جان سکیں گے کہ کس طرح اس نے ہندوستان پر انگریزی استعمار کی حوصلہ افزائی کی اور آزادی کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔

مصنف کے فرزند ارجمند ڈاکٹر زاہد اشرف کی محنت بھی قابلِ داد ہے جنہوں نے حکیم صاحب کے کام کو مدوّن اور مرتّب کیا۔ کتاب کا ٹائٹل دلکش اور خوبصورت ہے۔ جلد بھی مضبوط ہے۔ ❁❁❁

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

(Recap of verses 01 – 25 of Surah 7, Al-A'raf and exposition of verses 26 – 39 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 01 – 25 (inclusive) of Surah 7, Al-A'raf

This section of Surah 7, Al-A'raf (Verses 1 through 25) commences with the profound and unequivocal declaration that the Qur'an is the Book of Allah *(SWT)*, revealed to the Messenger *(SAAW)* of Allah *(SWT)* – Muhammad *(SAAW)*. Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* not to feel constraint in his *(SAAW)* heart nor hesitate in conveying the Qur'an and warn people with it. This does not mean that the Prophet *(SAAW)* had any doubts about the Qur'an; rather the constraint experienced by him *(SAAW)* was because of the affectionate concern for his *(SAAW)* people. Thus Allah *(SWT)* comforts His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* by instructing him *(SAAW)* that his *(SAAW)* only duty is to remind them of Allah's *(SWT)* Message and warn them with this Qur'an and that it is not his *(SAAW)* responsibility or obligation to see and ensure who becomes a Muslim and who rejects faith. The Holy Prophet *(SAAW)* invited Ummah (believers) and nonbelievers to follow the commandments of the Qur'an and the Sunnah of the Prophet *(SAAW)*. He *(SAAW)* cautioned them not to follow those who order them to disregard the Messenger *(SAAW)* or tell them to associate partners with Allah *(SWT)*. It must be noted that the central theme of the whole Surah, and of the present discourse, is the guidance which man needs in order to live a wholesome life, the knowledge which he requires in order to understand the reality of the universe and his own being and the purpose of his existence; the principles which he needs to serve as the basis for morality and social life as well as culture and civilization. In this regard man should look to Allah *(SWT)* alone and follow exclusively, the Guidance which He *(SWT)* has communicated to mankind through His *(SWT)* Messenger *(SAAW)*. To look to anyone other than Allah *(SWT)* is perilous for it has always spelled disaster in the past, and will always spell disaster in the future. This is the main theme of this Surah, and of the present discourse, i.e., warning the unbelievers about the consequences of their denial through examples of punishments inflicted upon former generations for their wrong attitude and behaviour towards Allah's *(SWT)* Messengers *(AS)* and His *(SWT)* Message. It is elaborated that those who were wrongdoers and transgressors, when Allah *(SWT)* inflicted torment upon them,

they admitted to be sinful and on wrong path. However, it was too late at that point for them to seek redemption.

This section also elucidates that on the Day of Resurrection, Allah *(SWT)* will ask His *(SWT)* servants that how did they treat His *(SWT)* Messengers *(AS)* and how did they respond to the Messages that He *(SWT)* sent them *(AS)* with. Similarly, the Messengers *(AS)* will also be questioned if they *(AS)* had delivered His *(SWT)* Message to their people or not. The words 'call to account' refers to the questioning people will be subjected to on the Day of Judgement. This shows that on the Day of Judgement, "Prophethood" will be the main basis of reckoning. On the one hand, the Prophets *(AS)* will be questioned about the efforts they made to convey Allah's *(SWT)* Message to mankind. On the other hand, the people to whom the Prophets *(AS)* were sent, will be questioned about their response to the message. With regard to individuals and communities who did receive Allah's *(SWT)* Message through the Prophets *(AS)*, the Qur'an states explicitly, that they will have no justification whatsoever to put forward a defence of their disbelief and denial, of their transgression and disobedience. They are doomed to be cast into Hell in utter helplessness and dejection.

This section of Surah Al-A'raf (Verses 1 through 25) also refers to the Book of deeds, which will be placed before every human being on the Day of Resurrection and they all will find every iota of deed that they did during their terrestrial life. Allah *(SWT)* is Omnipotent, Omnipresent and Omniscient; hence, He *(SWT)* knows ALL. It is also indicated that the weighing of good and bad deeds on the Day of Judgment is true and, on that Day, whoever has his good deeds 'heavier', then he will surely be admitted into Paradise – the ultimate abode for those who are successful. A life of falsehood, however long it lasted, and however full of worldly achievements, will carry no weight at all. Weighed in the Balance, the devotees of falsehood will discover that their life-long deeds do not even weigh so much as a bird's feather. It is also declared that on the other hand, those who will find their scale lighter, due to being lacking in good deeds and aplenty with evil deeds, then they shall find themselves in loss for they had disbelieved in Allah's *(SWT)* revelations.

This section elucidates that Allah *(SWT)* has blessed mankind with ownership and control on this earth. He *(SWT)* has made this earth a place of comfort and as a means of provision for His *(SWT)* servants, so that they should show gratitude to their Lord *(SWT)*. But human beings are prone to ingratitude and heedlessness and most of them show little gratitude to Him *(SWT)*. This verse pronounces this bitter truth. The creation of Adam *(AS)* is also elucidated and that Allah *(SWT)* commanded the angels to prostrate before Adam *(AS)* and they all obeyed their Lord *(SWT)* except *Iblees* (who was, in fact, a Jinn) who rejected the command of Allah *(SWT)* and did not prostrate to Adam *(AS)*. The text makes it very clear that prostration before Adam *(AS)* was in his *(AS)* capacity, as the representative of all mankind and not in his *(AS)* personal capacity. Therefore, "man" is Allah's *(SWT)* Vicegerent on earth. What distinguishes man from other animals is not just his capacity to speak or his gregariousness but the moral responsibility and trust with which he has been invested. Thus, one's whole perspective about the man and everything relating to him is changed. Rather than looking downwards to species of being lower than the human, man will turn his gaze upwards.

This section further elucidates the real reason for the rebellion of *Iblees* (a Jinn) against Allah *(SWT)* and, by extension, against all humans. The Jinn are created from fire whereas Allah *(SWT)* created the body of humans from clay. The Jinn are similar to humans in the manner that both are required to worship Allah *(SWT)* and follow Islam and both are given the free will to exercise, therefore, like humans they may either be obedient or disobedient to their Creator *(SWT)*. Thus, when Allah *(SWT)* commanded *Iblees* (a Jinn) to prostrate before Adam *(AS)*, he became arrogant and jealous from the superiority given to the humans as he only saw the lower side of the man (clay) and failed to see the higher side (soul), therefore, he refused to obey and rejected Allah's *(SWT)* command. This verse explicates that the rebellious nature and arrogance of *Iblees* (Satan) earned him nothing but the wrath of Allah *(SWT)* and was thrown out of Paradise. *Iblees* (Satan) implored Allah *(SWT)* to grant him life till the Last Day so that he can prove that these humans whom Allah *(SWT)* has chosen above him and all other creations are disobedient to Allah

(SWT). Thus, Allah *(SWT)* gave him (*Iblees*) respite till the Day of Judgment. *Iblees* (Satan) became a staunch enemy to Adam *(AS)* and his progeny and is always planning to mislead them from the right path. This is the basis of the struggle between good and evil, truth and falsehood, with *Iblees* and his followers on one side and Allah's *(SWT)* servants on the other. The sheer misguided character of *Iblees* (Satan) stems from his arrogance, vanity, and jealousy. Instead of recognizing that it was he who was in error, *Iblees* was adamant that Allah *(SWT)* had misguided him! Not only that, but the eternally accursed Satan falsely insisted that as Allah *(SWT)* had "misguided" him and expelled him from the Paradise and His *(SWT)* Mercy, hence he would leave no stone unturned to misguide Allah's *(SWT)* servants, i.e., the progeny of Adam *(AS)* till the appointed time (The Hour), thus leaving for himself no chance of redemption whatsoever. It is further expounded that *Iblees* (Satan) went on to blaspheme beyond that by vowing that he would (try to) mislead (all of) Allah's *(SWT)* servants from all sides and directions by raising doubts in them about their beliefs and causing confusion in their religion, thus luring them to the path of evil, away from the Right Path. *Iblees* added that most humans will not show gratitude to Allah *(SWT)* but will follow their desires and the evil ways that he will lure them towards. Thus, *Iblees* blasphemously challenged Allah *(SWT)* out of vanity, jealousy, and arrogance, as his heart and fate had been sealed by then. What is meant is that Satan would make use of the respite granted to him until the Last Day, and he would do so to "prove" that "man" did not deserve a position superior to his. The respite asked for by Satan and granted to him by Allah *(SWT)* includes not only the time but also the opportunity to mislead Man. At the same time, it has also been made quite clear that Satan was not granted the power to lead men into error against their will. Thus, all that Satan can do is to cause misunderstanding, to make people cherish false illusions, to make evil and error seem attractive, and to invite people to evil ways by holding out to them the promise of immense pleasure and material benefits. He would have no power, however, to forcibly pull them to the Satanic way and to prevent them from following the Right Way. Allah *(SWT)* also declares that whoever amongst the offspring of Adam *(AS)* will

follow Satan and his evil ways, then he will surely be thrown into the Hellfire in the Hereafter.

It is elucidated in this section that Allah *(SWT)* allowed Adam *(AS)* and Eve *(AS)* to reside in this Paradise for a while to test them and show them a glimpse of what was to come, i.e., how *Iblees* would be an enemy to them and their progeny and would try to lead them astray, and what man would get if he obeys Allah *(SWT)*. Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were forbidden to go near a particular tree. *Iblees* plotted against Adam *(AS)* and Eve *(AS)* and suggested to them, with treachery, by whispering into their ears. *Iblees* wanted to make them disobey their Lord *(SWT)* and thus reveal to them the private parts of their bodies that were hidden from them before. Therefore, he lied to them and told them that the reason that Allah *(SWT)* had forbidden them to eat from that tree (mentioned in the previous verse) was that He *(SWT)* did not want them to be like angels or live in this Paradise forever. It was, of course, a blatant lie told deceitfully by *Iblees*, establishing the treachery of *Iblees* and the simplicity and honesty of Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. *Iblees*, to put weight behind his lie and to persuade Adam *(AS)* and Eve *(AS)* into eating the forbidden fruit from the tree, even swore by Allah *(SWT)* that he was telling them the truth and that it was in their 'best interest' that they trusted him and followed him. The 'error' and 'disobedience' by Adam *(AS)* and Eve *(AS)* of Allah *(SWT)* cannot be termed as a sin or even an iota of any such intent, as it only arose from the treacherous deception and confusion caused by the cursed *Iblees*. When Adam *(AS)* and Eve *(AS)* ate the forbidden fruit from the tree, the private parts of their bodies that were hidden from them before those were made visible to them, and thus they began to cover themselves with the leaves from the trees of Paradise, i.e., making them as a dress. This also alludes to the innate modesty and purity of both Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. Thereafter, Allah *(SWT)* reminded them of His *(SWT)* commandments and warnings to Adam *(AS)* and Eve *(AS)* about the enmity and hatred of *Iblees* towards them and their offspring.

This section ends by clearly elaborating the difference between the behaviour of Adam *(AS)* and Eve *(AS)*, as opposed to the accursed Iblees. While Adam*(AS)* and Eve*(AS)* were remorseful of their action

and begged for Allah's *(SWT)* forgiveness and mercy for their slip, *Iblees* remained arrogant and full of vanity even after committing blasphemy. Adam *(AS)* and Eve *(AS)* repented but they did not know how to ask for Allah's *(SWT)* forgiveness. Allah *(SWT)* bestowed His *(SWT)* mercy on them by teaching them appropriate words. Thus Allah *(SWT)* accepted their repentance and pardoned them. The said words are as follows:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ

Through this anecdote, the man has been warned to remain vigilant and to resist the evil prompting of Iblees. It is but natural that a man being inherently weak, can get tempted but he is required to make amends. A few of the weaknesses of man mentioned in the Holy Qur'an are as follows:

"But, man is ever more quarrelsome than anything." *(Al- Kahf,15:54)*

"Man is ever hasty." *(Al-Isra,17:11)*

"Man is ever ungrateful." *(Al- Isra,17:67)*

"Man is ever miserly." *(Al-Isra,17:100)*

"Verily, he is unjust (to himself) and ignorant." *(Al-Ahzab,33:72)*

"Yet behold! He (stands forth) as an open opponent." *(Ya-sin, 36:77)*

"Verily, We have created man in toil." *(Al- Balad.90:4)*

Thus, a clear line is drawn between the way of Satan and the way that befits a man. Satan's way is characterized by rebellion against Allah *(SWT)*, by arrogantly persisting in that rebellion even after having been warned, and by trying to mislead the righteously disposed man towards sin and disobedience. As opposed to this, the way that befits man is to resist the evil promptings of Satan and to be constantly vigilant against Satanic machinations. But, if despite all these precautions, a man does swerve from the course of obedience, he should turn, as soon as he realizes his fault, to Allah *(SWT)* in penitence and remorse and make amends. This is the lesson that Allah *(SWT)* conveys to man through this anecdote. The Qur'an seeks to impress upon the opponents of the Prophet *(SAAW)* that the way which they are following is the way of Satan. To become indifferent to Allah's *(SWT)* Guidance, to take satans among men and

jinn as their protectors, and to persist in disobedience despite repeated warnings, amounts to adopting a Satanic attitude. It demonstrates that they have fallen prey to the snares of the arch-enemy and have been overpowered by him. This attitude will lead to their total undoing just as it led to Satan's undoing. Anyone who has even an iota of understanding should heed and emulate the example of his fore-parents – Adam *(AS)* and Eve *(AS)* – who repented and made amends after their disobedience were forgiven by Allah *(SWT)*.

This also refutes the false concept of 'The Original Sin' amongst the Christians. Islam does not accept the notion of 'The Original Sin' whereby Adam's *(AS)* disobedience to Allah *(SWT)* has been inherited by all his *(AS)* descendants. In other words, it does not accept that all human beings on earth are sinful because of their forefather's sins. Qur'an states that when Adam *(AS)* and Eve *(AS)* slipped, they beseeched and received Allah's *(SWT)* forgiveness. The long and short of it is that *Iblees* and Adam *(AS)* became enemies forever. *Iblees* prayed to Allah *(SWT)* to grant him life till the Last Day so that he can prove that these humans whom Allah *(SWT)* has chosen above him and all other creations are disobedient to Allah *(SWT)*, and thus he became an enemy to Adam *(AS)* and his progeny. This is the basis of the struggle between good and evil, truth and falsehood that has been going on for centuries and will continue till the appointed time, i.e., The Hour. It must be noted that Allah's *(SWT)* command that Adam *(AS)* and Eve *(AS)* 'go down' should not be misunderstood to mean that their departure from Paradise was by way of punishment. The Qur'an has made it clear many a time that Allah *(SWT)* accepted Adam *(AS)* and Eve's *(AS)* repentance and pardoned them. Thus, the command does not imply punishment. It rather signifies the fulfillment of the Divine purpose for which man was created. When Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were sent down to earth, they were told that the earth will be a dwelling place for them for a temporary period (till The Hour). They will live, die, and then be buried in their graves, from which they will be then resurrected on the Day of Judgment. That goes for the entire human race from the first human to the last.

==========

Exposition of verses 26 – 39 of Surah Al-A'raf

Verse 26

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۝

"O children of Adam, We have bestowed upon you clothing to conceal your private parts and as adornment. But the clothing of righteousness – that is best. That is from the signs of Allah that perhaps they will remember."

This verse commences by declaring that Allah *(SWT)* has given three kinds of clothing for the children of Adam *(AS)* to wear viz. *Libas*, *Rish* and *Libas of Taqwa*. *Libas* refers to the dress which is used to cover body parts the uncovering of which is taken as immodest and shameful. *Rish* refers to the dresses which Allah *(SWT)* has blessed humans with for beautification and to make them look handsome. The third kind of dress mentioned is the dress of *Taqwa* (piety). The *Libas of Taqwa* conceals human weaknesses and moral shortcomings and acts as a spiritual dress of good deeds and fear of Allah *(SWT)*. The verse also elucidates that Allah *(SWT)* has revealed these 'signs' as an invitation for the people to understand.

It must be noted that by referring to an important aspect of the story of Adam *(AS)* and Eve's *(AS)* the attention of the people of Arabia of those days was drawn to the evil influence of *Iblees* (Satan) upon their lives. Under Satan's influence, they had begun to see dress merely as a shield of protection against the severity of the weather and as a means of adornment. The basic purpose of dress to cover the private parts of the body – had receded into the background. People had no inhibition about the immodest exposure of the private parts of their bodies in public. To publicly take a bath naked, to attend to the call of nature on thoroughfares, were the order of the day. To crown it all, in the course of Pilgrimage they used to circumambulate around the Ka'bah in stark nakedness. Women even surpassed men in immodesty. In their view, the performance of religious rites in complete nudity was an act of religious merit.

Immodesty, however, was not an exclusive characteristic of the people of Arabia. Many nations indulged in it in the past, and many nations continue to indulge in it even now. Hence the message embodied in these verses is not directed just to the people of Arabia. It is rather directed to all men. Mankind, which is the progeny of Adam *(AS)*, is warned against this particular aspect of Satanic influence on their lives. When men show indifference to Allah's *(SWT)* Guidance and turn away from the Message of the Prophets *(AS)*, they virtually place themselves at the mercy of Satan. For it is Satan who makes them abandon ways that are consistent with true human nature and who leads them to immodesty in the same way as he did with Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. Were man to reflect on this, it would become quite evident that when he is deprived of the guidance of the Prophets *(AS)*, he cannot even appreciate, let alone fulfill, the primary requirements of his true nature.

Verse 27

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"O children of Adam, let not Satan tempt you as he removed your parents from Paradise, stripping them of their clothing to show them their private parts. Indeed, he sees you, he and his tribe, from where you do not see them. Indeed, We have made the devils allies to those who do not believe."

In this verse, Allah *(SWT)* warns the children of Adam *(AS)* that they should guard themselves against the deception of Satan and his followers, lest, he also deceives them like he did to their parents, Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. The verse also explicates that Satan and his followers can see and interact with humans, while human beings cannot see them. The *Jinns*, like the angels, can also transform themselves into the shape of human beings, which makes their deception even more dangerous. Moreover, they also act as 'sentinels' of the disbelievers.

These verses bring into focus several important points. First, that the need to cover oneself is not an artificial urge in man; rather it is an

important dictate of human nature. Unlike animals, Allah *(SWT)* did not provide man with the protective covering that He *(SWT)* provided to animals. Allah *(SWT)* rather endowed man with the instincts of modesty and bashfulness. Moreover, the private parts of the body are not only, related to sex, but also constitute '*sawat*' that is, something the exposure of which is felt to be shameful. Also, Allah *(SWT)* did not provide man with a natural covering in response to man's modesty and bashfulness but has inspired in him the urge to cover himself. This is so that man might use his reason to understand the requirements of his nature, use the resources made available by Allah *(SWT)*, and provide himself a dress.

Second, man instinctively knows that the moral purpose behind the use of dress takes precedence over the physical purpose. Hence the idea that man should resort to dressing to cover his private parts precedes the mention of dress as a means of providing protection and adornment to the human body. In this connection, man is altogether different from animals. About the latter, the natural covering that has been granted serves to protect them from the severity of weather and also to beautify their bodies. However, that natural covering is altogether unrelated to the purpose of concealing their sexual organs. The exposure of those organs is not a matter of shame for them and hence their nature is altogether devoid of the urge to cover them. However, as men fell prey to Satanic influences, they developed a false and unhealthy notion about the function of the dress. They were led to believe that the function of dress for human beings is no different from that for animals, viz., to protect them from the severity of weather and to make them look attractive. As for concealing the private parts of the body, the importance of that function has been belittled. For humans have been misled into believing that their private parts are, in fact, like other organs of their body. As in the case of animals, there is little need for human beings to conceal their sex organs.

Third, the Qur'an emphasizes that it is not enough for the dress to cover the private parts and to provide protection and adornment to the human body. Man's dress ought to be the dress of piety. This means that a man's dress ought to conceal his private parts. It should also render a man reasonably presentable – the dress being neither too

shabby and cheap nor overly expensive and extravagant relative to his financial standing. Nor should dress smack of pride or hauteur, or reflect that pathological mental state in which men prefer characteristically feminine dresses and vice versa: or that the people belonging to one nation mimic people of other nations to resemble them, thereby becoming a living emblem of collective humiliation and abasement. The Qur'anic ideal can only be achieved by those who truly believe in the Prophets *(AS)* and sincerely try to follow Allah's *(SWT)* Guidance. For as soon as man decides to reject Allah's *(SWT)* Guidance, Satan assumes his patronage and by one means or another manages to lead him into error after error.

Fourth, the question of dress constitutes one of the numerous signs of Allah *(SWT)* which is visible virtually throughout the world. When the facts mentioned above are carefully considered it will be quite clear as to why the dress is an important sign of Allah *(SWT)*.

Verse 28

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

"And when they commit an immorality, they say, "We found our fathers doing it, and Allah has ordered us to do it." Say, "Indeed, Allah does not order immorality. Do you say about Allah that which you do not know?"

This verse refers to one of the many reprehensible and absurd customs of the Arabs before the advent of Islam. The people of Makkah and all those coming for the Pilgrimage would circumambulate around the Ka'bah naked. Allah *(SWT)* revealed this verse to abolish that disgraceful custom and rebutted their false claim that their elders and forefathers had been doing this all along and the false notion that it is what Allah *(SWT)* has 'told them to do'. Therefore, it is said to them that Allah *(SWT)* never commands a shameful act and that they are attributing a blatant lie to Him *(SWT)* without having any proof or evidence for it. In short, the verse disproves the pre-Islamic Arabian practice of circumambulation around the Ka'bah in stark nakedness. It also categorically rejects

the false notion of those people that nakedness during circumambulation had been enjoined by Allah *(SWT)*.

The simple and succinct Qur'anic statement that 'Allah *(SWT)* never enjoins any, indecency' stands as the overwhelming argument against many false beliefs that were entertained by the people of Arabia. For a fuller appreciation of this argument the following points should be kept in mind:

First, that the people of Arabia stripped themselves while performing certain religious rites under the mistaken notion that it had been so enjoined. But on the other hand, they were agreed that nudity was a shameful thing so that no Arab of any standing could ever approve of appearing naked in any respectable assembly or market place.

Second, notwithstanding their reservation about nudity, they uncovered themselves totally while performing certain religious rites on the ground that religion was from Allah *(SWT)*. Hence there was nothing objectionable about performing a religious act in a state of nakedness for Allah *(SWT)* had so enjoined them regarding the performance of that rite. Here the Qur'an confronts them with a clear question: How can they believe that Allah *(SWT)* could order them to do something which involves nakedness and which they know to be inherently shameful? What is implied is that Allah *(SWT)* could not command them to commit indecency, and if their religion contained elements of indecency then this is positive proof of its not being from Allah *(SWT)*.

Verse 29

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۫ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ

"Say, [O Muhammad], "My Lord has ordered justice and that you direct yourselves [to the Qiblah] at every place [or time] of prostration, and invoke Him, sincere to Him in religion." Just as He originated you, you will return [to life] –"

The verse ordains to worship none but Allah *(SWT)* and face the Ka'bah during all prayers (worship). But this injunction is not

limited to Prayer alone, instead, it also encompasses being upright and just in all acts of worship, dealings, and transactions.

The real prerequisite is to worship Allah *(SWT)*, purely and exclusively, without associating anyone with Him *(SWT)* in any capacity. This also indicates that only obedience is not enough for all is in vain without sincerity (*Ikhlas*).

The verse elaborates that it is Allah *(SWT)* Who created all in the first place and it is He *(SWT)* Who will make all rise again on the Day of Resurrection and Judgment. The verse unequivocally declares that Allah *(SWT)* has nothing to do with the foolish rituals of those who deviate from the Straight Path. So far as the religion truly prescribed by Him *(SWT)*, i.e., Islam is concerned, its fundamental principles are the following:

That man should base his life on justice and righteousness.

That man's worship should have the right orientation, i.e. that it should be directed to Allah *(SWT)* alone and should be free of every trace of devotion to others than Allah *(SWT)*, that man should reserve his absolute enthralment and bondage for the One True God – Allah *(SWT)* – alone. All these should have only one direction - the One *(SWT)* that is truly worthy of worship.

That man should invoke Allah *(SWT)* alone to keep him rightly directed, to grant him help and succor to favour him with protection and security. This should be done provided one's life is oriented to serving Allah *(SWT)*. Invoking help from Allah *(SWT)* would be ludicrous if man's life is based on unbelief, polytheism, disobedience to Allah *(SWT)*, or serving a variety of gods other than the One True God – Allah *(SWT)*. Such a prayer would amount to asking Allah's *(SWT)* help in strengthening one's rebellion against Him *(SWT)*.

That man should have full conviction that in the same way as Allah *(SWT)* caused him to be born in the world, He *(SWT)* will also restore him to life after death and will make him stand before Himself *(SWT)* to render an account of his life.

Verse 30

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

"A group [of you] He guided, and a group deserved [to be in] error. Indeed, they [i.e., the latter] had taken the devils as allies instead of Allah while they thought that they were guided."

In this verse, Allah *(SWT)* has differentiated between those who are misguided and those whom He *(SWT)* has guided on the Right path, i.e., Islam. The verse elucidates that there are people whom He *(SWT)* has guided to the Straight Path while there are others who have fallen into misguidance and error because they made the satans/devils as their protectors and friends instead of Him *(SWT)*, yet they falsely think that they are on the Right Path.

Verse 31

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

"O children of Adam, take your adornment [i.e., wear your clothing] at every masjid, and eat and drink, but be not excessive. Indeed, He likes not those who commit excess."

This verse again refutes the sham custom of circumambulation around the Ka'bah while naked. Instead, Allah *(SWT)* commands the believers to present themselves in the best of their adornments when going out for prayers in the mosque, for every place of prostration is, in essence, called a *'masjid'*. This also indicates that covering oneself for *Salat* (prayer) and *Tawaf* (circumambulation) is what is meant by adorning oneself to worship Allah *(SWT)*. Hence the word adornment is used rather than the word covering, to demonstrate that what is meant is that a person should adorn himself and not limit it to simply covering. Another of the wrong customs that the pagans attributed to Allah *(SWT)* were that they would skip eating and drinking during the days of Pilgrimage. But Allah *(SWT)* commands the believers to eat and drink from all pure things that He *(SWT)* has provided for them, as long as they abstain from what He *(SWT)* has prohibited and from extravagance.

Thus, the verse elaborates that wearing a dress serves the two-fold purpose of covering and giving one a decent appearance. The directive to pray in a proper and decent dress is aimed at refuting the misconception entertained by ignorant people down the ages that man should worship Allah *(SWT)* either in a nude or semi-naked state, or at least have a shabby and unkempt appearance while worshipping. In this verse, people are being told the opposite of this. At the time of worship, they should not only be free from all kinds of nudity and indecency but should also be in a decent dress.

Allah *(SWT)* does not want to subject man to want and misery or starvation or to deprive him as such of the good things of this worldly life. On the contrary, it pleases Him *(SWT)* that man should appear in good decent dress and enjoy the clean food provided for him by Allah *(SWT)*. There is nothing sinful in that. As for sin, it consists of transgressing the bounds set by Allah *(SWT)*. This transgression could be committed in both ways: by making the unlawful lawful, or by making the lawful unlawful.

Verse 32

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

"Say, "Who has forbidden the adornment of [i.e., from] Allah which He has produced for His servants and the good [lawful] things of provision?" Say, "They are for those who believe during the worldly life [but] exclusively for them on the Day of Resurrection." Thus do We detail the verses for a people who know."

This verse is an admonishment for those who think that good dress and good food made lawful by Allah *(SWT)* is unlawful for them. Islam does not teach to live in tattered rags or torn clothes despite having the means to adorn themselves, therefore an unkempt, dirty and slovenly *Faqir* cannot claim any 'privileged sanctity' in Islam. Instead, Allah *(SWT)* says that He *(SWT)* has provided for the believers with the best of clothing so that they should adorn themselves and has provided for them good and pure things for food so that they eat from them and be grateful to Him *(SWT)*. Since it is Allah *(SWT)*

Himself *(SWT)* Who has created all good and pure things for man, it obviously could not have been His *(SWT)* intent to make them unlawful. Now, if there is any religion or any ethical or social system which forbids those things, or considers them an insurmountable barrier to man's spiritual growth, it has an intellectual orientation which itself is evident proof of its not having been prescribed by Allah *(SWT)*. This is an important argument which the Qur'an advances in the refutation of false creeds. An appreciation of this argument would help one understand the Qur'anic line of argumentation as such.

Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* to elucidate that even though all these blessings that He *(SWT)* has provided in this earthly life are also enjoyed by the disbelievers (other than the believers), but in the Hereafter the disbelievers will have no share in it, for *Jannah* (Paradise/Heaven) has exclusively been made for the believers. All the clean and beautiful things created by Allah *(SWT)* are meant, in principle, for the believers even in this world, for they are Allah's *(SWT)* faithful subjects, and it is fidelity to Allah *(SWT)* that makes one deserve the enjoyment of the things which are Allah's *(SWT)*. However, all men are under a test in this world. Hence even those who are disloyal to Allah *(SWT)* have been granted respite to mend their ways and are, therefore, not denied His *(SWT)* worldly bounties. To test those disloyal to Allah *(SWT),* these bounties are at times lavished upon them even more abundantly than on Allah's *(SWT)* faithful servants. But the character of Next Life will be different. For one's station, there will be determined entirely by one's righteousness and justice. Allah's *(SWT)* bounties in the Hereafter, therefore, will be for the faithful alone. As for the unfaithful, those who were disloyal to Allah *(SWT)* even though every fibre of their being was nourished by the sustenance provided by Him *(SWT)*, will have no share whatsoever of those bounties in the Hereafter.

The verse also declares that Allah *(SWT)* has made His *(SWT)* signs and revelations clear and abolished all the superstitions that were falsely attributed to Him *(SWT)*.

Verse 33

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ

يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾

"Say, "My Lord has only forbidden immoralities – what is apparent of them and what is concealed – and sin, and oppression without right, and that you associate with Allah that for which He has not sent down authority, and that you say about Allah that which you do not know."

In this verse, Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to enumerate and tell the idolators the things which He *(SWT)* has made unlawful for them. The verse elucidates that Allah *(SWT)* has made it unlawful to commit shameful and dishonourable deeds like adultery and fornication etcetera, whether committed openly or in secret, whether done discretely or as a profession. The verse also declares the prohibition of all kinds of wrongdoings, whether related to oneself or the rights and dealings with others. Allah *(SWT)* sternly forbids committing *Shirk* (polytheism) i.e., taking partners with Him *(SWT)*, and attributing lies to Him *(SWT)*.

It must be noted that the word 'sin' conveys the sense of man's deliberate neglect of his duty to Allah *(SWT)*, his failure to pursue Allah's *(SWT)* good pleasure despite his having the capacity to obey and follow Him *(SWT)*. To exceed the limits set by Allah *(SWT)* and to enter an area that has been declared out of bounds for man constitute rebellion and transgression. According to this definition, the charge of rebellion will apply to all those who act according to their whims rather than following the directives of Allah *(SWT)*. It applies to those who behave as though they are the true masters of Allah's *(SWT)* Kingdom, claiming for themselves the prerogatives of God *(SWT)*. It also applies to all those who usurp the rights of others.

Verse 34

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٤﴾

"And for every nation is a [specified] term. So when their time has come, they will not remain behind an hour, nor will they precede [it]."

The verse commences by expounding that Allah *(SWT)* has determined a fixed term not only for every individual but for every 'nation' too,

on the face of this earth. If they do not do good and disbelieve during this time of test and 'probation', then when their term expires, they would not be given any respite even for a single moment nor will the Last Hour be delayed.

It must be noted that the expression 'fixed term' used in the verse should not give rise to the misconception that the term of a nation expires on a definite day, month, or year. What the statement means is that Allah *(SWT)* has laid down a minimum proportion between the good and evil deeds of a nation. As long as that nation can maintain that minimum proportion, its existence is tolerated so that it might be able to show its performance. Once a nation crosses that minimum limit, it is denied any further respite.

Verse 35

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"O children of Adam, if there come to you messengers from among you relating to you My verses [i.e., scriptures and laws], then whoever fears Allah and reforms – there will be no fear concerning them, nor will they grieve."

The essence of this verse is that Allah *(SWT)* has promised reward for those who, when Prophets *(AS)* of Allah *(SWT)* come to them with guidance and injunctions, listen to them carefully, and act accordingly with piety and righteousness. Those are the ones who will be saved from sorrow and grief (in the Hereafter) and they shall have eternal peace and comfort.

Verse 36

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"But the ones who deny Our verses and are arrogant toward them – those are the companions of the Fire; they will abide therein eternally."

Adding to the message of the previous verse, this verse elucidates that on the other hand, those who reject Allah's *(SWT)* Messengers

(AS) and disobey His *(SWT)* commandments will suffer eternal punishment of Hellfire.

It must be noted that reference to the continuous unremitting punishment of the unbelievers occurs invariably on occasions where the Qur'an narrates the coming down of Adam *(AS)* and Eve *(AS)* from Paradise. *Ref: (Al-Baqarah: Verses 38-9); (Ta Ha: Verses 123-4)*. What has been said here should be considered concerning the fact that at the very start of man's earthly life (at the time of Adam *AS* and Eve *AS*) he was informed of the evil results of unbelief.

Verse 37

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

"And who is more unjust than one who invents about Allah a lie or denies His verses? Those will attain their portion of the decree until, when Our messengers [i.e., angels] come to them to take them in death, they will say, "Where are those you used to invoke besides Allah?" They will say, "They have departed from us," and will bear witness against themselves that they were disbelievers."

This verse elucidates that although the disbelievers who invent lies and utter falsehood against Allah *(SWT)* and reject His *(SWT)* revelations are the most unjust people, yet they still get their due share of good things and life during the probation period in this world. But once that period expires, the angels of death will take their souls out of their bodies and they will be called to account for. They will be asked about the false deities that they used to invoke and worship besides Allah *(SWT)* but soon they will realize that the same false deities have forsaken them and thus they will confess their sin and will regret of what they used to do.

All men, whether good or bad, have been granted a definite term in this world which they will spend and obtain their share of worldly happiness and misery. But the real reward or punishment would be meted on the Day of Judgement.

Verse 38

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۭ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝

"[Allah] will say, "Enter among nations which had passed on before you of jinn and mankind into the Fire." Every time a nation enters, it will curse its sister until, when they have all overtaken one another therein, the last of them will say about the first of them, "Our Lord, these had misled us, so give them a double punishment of the Fire." He will say, "For each is double, but you do not know."

This verse further expounds on the message regarding the reward and punishment on the Day of Judgement and details of the conversations that would take place on that Day. It must be noted that each group of people is followed, even as it is preceded, by others. A group that inherits an error of outlook and conduct from its predecessors passes on the same, in turn, to future generations. In addition, whereas a group owes its wrong-doing partly to the wrong-doing of its predecessors, it will also be held responsible for leaving behind an evil legacy for future generations. The Qur'an, therefore, pronounces a double punishment on such a group: it will incur punishment for its misdeeds and also for leaving behind such a legacy for the coming generations. Several traditions elucidate this point. According to one such tradition the Prophet *(SAAW)* said: 'He who introduces a misleading innovation which does not please Allah *(SWT)* and His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* shall be held guilty for the sins of all those who follow that innovation without lessening in the least the burden [of sins] of those who followed the innovation,' (*Ref: Ibn Majah)* According to another tradition, he *(SAAW)* said: "The responsibility for all the murders committed in the world is shared by the first son of Adam *(AS)*[i.e. Cain] for he was the first to have innovated murder." *(Ref: Bukhari)*

We thus know that the individual or group responsible for introducing a wrong idea or practice is not only responsible to the extent of those sins, but shares the responsibility of the sins of all

those who are influenced by him. As long as the evil effects of that influence continue, their sins will be continually added to his account. This also shows that a person is not only accountable for the good or bad deeds that he commits, in fact he is also accountable for the influence of those deeds on others.

This may be illustrated by considering the case of someone who indulges in unlawful sex. All those whose bad examples, evil company, and inducements to evil caused a man to indulge in such an act have a share in the sin that he committed. The persons who influenced him in turn had been influenced by others. Were this chain of influence traced back to its ultimate origin, the blame would be fixed on the first person who demonstrated this unlawful way of satiating the sexual urge.

This does not detract from the fact that anyone who indulged in fornication is also accountable for the sin he committed. This is so because when he committed a sin he did so because he failed to make proper use of his capacity to distinguish between good and evil with which he had been endowed. He also did not pay due heed to the voice of his conscience and mobilize the power of self-control given him. Nor did he benefit from the knowledge of good and evil transmitted to him by pious men nor was he inspired by the noble examples of the God-fearing. Nor did he learn any lesson from the evil consequences of sexual misconduct. Instead, he succumbed to blind sexual lust which sought gratification at all cost. This much relates to the responsibility of the person who indulged in sexual misconduct.

But there is another dimension of that person's evil conduct – his propagation of that same evil among others which ruined the lives of countless people belonging to his generation and to the generations that follow. It is also possible that he might have been afflicted by some general disease which he then communicated to his generation and also to the generations that followed. His sexual misconduct might also have given birth to illegitimate children, unjustly passing on the burden of their upbringing to others, and making his offspring - without any justification - co-sharers in the fortunes and even the inheritance of others. The wrong that is thus perpetrated persists for

many generations. Likewise, it is also possible that the said criminal might, by his cunning, have led an innocent girl to sexually corrupt behaviour. That in turn is likely to awaken evil propensities in her which wreck the lives and homes of countless families, even generations. Also, by setting an evil example for his children, relatives, friends and the society at large a fornicator is likely to cast a bad influence on people around him and infect others with moral corruption. The evil consequences of such an act thus linger on for a long time. The moral corruption that ultimately, engulfs the society owes its origin to the person who initially introduced an evil. Justice, therefore, demands that such a culprit should also be held responsible for the subsequent evils which may be traced back to his initial act of corruption.

The same holds for good deeds. The reward for the heritage of goodness left behind by our predecessors from the earliest times should inevitably go to the credit of those men of the past who have continually transmitted that heritage to posterity down to our own time. If our generation takes good care of that heritage, enriches it, and passes it on to the coming generation, it also deserves a due reward for that. As long as our good acts leave a trace of good influence on history and continue to cast a good influence on people, mankind will reap the benefits of those acts.

This is the Qur'anic view of retribution. Every sensible person will agree that such a dispensation alone can ensure perfect justice. Appreciation of this concept should dispel the idea of those who believe that men can be fully rewarded or punished for their deeds within the confines of this worldly life. Likewise, such an appreciation should also dispel the views of those who believe that the transmigration of souls alone can ensure full justice to all men. Such people have blundered because they have neither grasped fully the nature and consequences of human acts nor the nature and requirements of perfect justice. It is obvious that the consequences of individuals' acts are not visible during their lifespan - say sixty or seventy years or so. Instead, human activities, both good and evil, influence the lives of countless people belonging to countless generations. One cannot, therefore, be brought to justice during one's

lifetime, since only a small part of the consequences of those acts have yet come to the surface. Moreover, the limited possibilities available in the present world are quite inadequate for bringing people to justice. Just consider the hideous crime of someone who pushes us to a world war. As things stand, the catastrophic consequences of such a crime would affect the lives of billions of men through the ages. Is there any punishment - physical, spiritual, or material - which can be deemed even remotely, proportionate to that crime? Likewise, no worldly reward, however valuable, can adequately recompense for the noble services rendered by a philanthropist which will benefit numerous people for thousands of years.

Having viewed the question from this angle, one readily, concludes that there must necessarily be a life in the Hereafter so that full justice can be meted out to everyone. Here all human beings are brought together, their full records are made available, and the reckoning is made by Allah *(SWT)* Himself *(SWT)*, Whose *(SWT)* knowledge embraces everything. Additionally, men should be granted unlimited spans of life, and infinite possibilities should be made available for receiving compensation.

A little reflection on this will help us see how false the doctrine of the transmigration of souls is. Those who subscribe to this doctrine fail to realize that eternal life is needed to mete out recompense to people for the deeds they commit during their relatively brief spans of life. If one were to believe in the unending cycle of life and death it would become impossible to reward or punish anyone for his actions, for each span of life would go on accumulating endlessly. The arrears would never be cleared.

Verse 39

وَقَالَتْ أُولٰىهُمْ لِأُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾

"And the first of them will say to the last of them, "Then you had not any favour over us, so taste the punishment for what you used to earn."

In addition to the above verse, the Qur'an elsewhere recounts the mutual incriminations of the dwellers of Hell. For example, it occurs

in Surah al-Saba' in the following words: 'Could you but see when the wrong-doers will be made to stand before their Lord, throwing back the word (of blame) on one another! Those who had been abased will say to the arrogant ones: "Had it not been for you, we should certainly have been believers!" The arrogant ones will say, to those who had been abased: "Was it we who kept you back from Guidance after it reached you? Nay, rather it was you yourselves who transgressed." *(Ref: Al-Saba': 31-2)*. This means that since the misguided people themselves were not keen on receiving the right guidance, they fell victims even more to the forces of misguidance. Out of their excessive worldliness they chose to follow their ungodly leaders. Granted that it was the forces of misguidance which had invented ideologies such as materialism, excessive worldliness, and nationalism. But when people were attracted to these false ideologies, they did so out of their weaknesses. These forces of evil achieved success because what they offered was to the utmost liking of the people. Again, the people who were tempted to embrace counterfeit religious ideologies were themselves to blame for falling prey to them since there was an inner urge in them to accept such ideologies. Rather than submitting to the One True God – Allah *(SWT)* – and to rigorous moral discipline, they looked for deities that would help them to achieve their worldly purposes. Naturally, they invented deities of their liking. They also desired the intercession of those who would let them grow in worldliness and godlessness, and yet who would also ensure their redemption in the Next World. As they preferred a religion that would not make their life 'a bit dry', a permissive religious cult that did not object to any kind of self-indulgence was developed. This establishes clearly that the external forces of evil alone are not to blame. The people who succumb to evil and error equally share the blame. This neither condones the role of those who seek to mislead others nor detracts from the responsibility of those who choose to be misled.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت وتعارف اور حقوق ومطالبات
جیسے علمی وعملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفیٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجئے

حقیقت واَقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحَدید

(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501 (042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org

Quarterly **HIKMAT-E-QURAN** Lahore
July - Sep 2021 Vol. 40 No. 3

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ